پشتو شاعری کی تاریخ
(ایک تحقیقی جائزہ)
پروفیسر پریشان خٹک
اکادمی ادبیات پاکستان ۰ اسلام آباد

پشتو شاعری کی تاریخ

(ایک تحقیقی جائزہ)

پشتو شاعری کی تاریخ

(ایک تحقیقی جائزہ)

پروفیسر پریشان خٹک

اکادمی ادبیات پاکستان ۰ اسلام آباد

نگران ——— پروفیسر پریشان خٹک

بسعی و اہتمام ——— غلام ربانی آگرو

معاون ——— مقبول عامر

اشاعت اول ——— پانچ سو (جنوری ۱۹۸۸ء)

قیمت ——— ۵۴ روپے

کتابت ——— الطاف حسین

طابع ——— کرشل پرنٹرز بلیوایریا، اسلام آباد

ناشر ——— اکادمی ادبیات پاکستان ۔ اسلام آباد

عرضِ ناشر

پشتو شاعری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود پشتو زبان۔ پشتو کے اولین شاعر امیر کروڑ سے لے کر آج تک جتنی شاعری ہوئی ہے وہ لبّوں میں رچے بسے جذبوں کی آئینہ دار ہے یوں تو اس شاعری کا بنیادی موضوع بھی انسانی قدریں ہیں تاہم اس میں پشتون خطے کی مٹی اور فضاؤں کی بوباس صاف محسوس ہوتی ہے۔

پروفیسر پریشان خٹک صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں پشتو شاعری کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ صنف کس طرح سنگلاخ چٹانوں کی سرزمین سے صاف وشفاف چشمے کی طرح پھوٹی اور پھر گنگناتی ندی کی طرح پتھروں سے سر پٹکتی ہوئی وادیوں کو شاداب کرتی رہی۔ کتاب کے مطالعے سے ان مراحل پر روشنی پڑتی ہے جن سے گزر کر پشتو شاعری چشمے سے دریا بنی ہے۔

پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترقی و ترویج اور اس کے وسیلے سے چاروں صوبوں میں قومی یک جہتی کو فروغ دینا اکادمی ادبیات کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

غلام ربانی آگرو
دسمبر ۱۹۸۶ء

ترتیب

ابتدائیہ

تحریری ادب سے پہلے

پشتو شاعری کا آغاز کب ہوا ؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں ہزاروں سال پیچھے جانا پڑے گا ، اُس دور کی طرف جب قبائلی نظام میں بٹے ہوئے پشتون خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ تحریر کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور پشتو زبان ایک بولی کی حیثیت سے زندہ تھی تاہم پشتو شاعری اُس وقت بھی یقیناً موجود تھی کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فلک بوس پہاڑوں خوب صورت آبشاروں، شفاف جھیلوں اور شاداب وادیوں کے اس جنت نظیر خطے میں جہاں فطرت خود شاعری کرتی نظر آتی ہے، وہاں کے باسیوں نے نغمے نہ الاپے ہوں یا گیت نہ گائے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں پشتو شاعری کا تحریری ثبوت ۱۳۹، ہجری سے پہلے نہیں ملتا۔

پشتو شاعری کی تاریخ مرتب کرتے وقت ہم ان حالات و واقعات سے صرف نظر نہیں کر سکتے جن سے پشتون قبائل دوچار ہوتے چلے آئے ہیں۔ پشتونوں کا خطہ ایسی جگہ واقع ہے کہ انھیں ہمیشہ سے وسطِ ایشیا و سے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والی فوجوں سے برسرِپیکار رہنا پڑا ہے۔ آریاؤں سے لے کر سکندرِاعظم اور چنگیز خان تک کوئی بھی اس خطے سے بہ آسانی نہیں گزر سکا۔ اسے لہو کا خراج ضرور دینا پڑا ہے۔ ان حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم اُن ادوار کا تجزیہ کرتے ہیں

جن میں پشتون نسل اور پشتو زبان زندہ رہی ہے تو ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو حالات کے بہاؤ نے یہ موقع کبھی نہیں دیا کہ متمدن شہری زندگی گذار سکیں جس میں لکھائی پڑھائی کو فروغ ملتا ہے لہٰذا ان کی زبان چونکہ تحریر میں نہیں آسکی تھی اسی لیے ان کی شاعری بھی تحریر میں نہ آسکی۔ حالانکہ پشتو زبان ایک خاص وجہ سے دنیا کی باقی تمام زبانوں سے مختلف ہے۔ وہ یہ کہ پشتو صرف پشتونوں کی زبان کا نام نہیں، ان کی ثقافت، ضابطۂ اخلاق اور رسم و رواج کا نام بھی پشتو ہے۔ پھر بھی اتنے مضبوط بندھن کے باوجود یہ زبان اور ضابطۂ اخلاق سینہ بہ سینہ چلا آتا رہا اور پشتو زبان کو رسم الخط میں لانے کے قواعد وضع نہیں کیے گئے اور شاید اس کی کبھی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ یہی حال پشتو شاعری کا تھا جو زبانی چلی آرہی تھی۔ آج بھی شمالی پشتون علاقوں میں بہت اچھے اچھے شعرا جنم لیتے ہیں جن کا کلام دلچسپ بھی ہوتا ہے اور پُرمعنی بھی۔ شاعر زا ان پڑھ ہوتا ہے مگر اسے اپنا سارا کلام حفظ ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں اس کی دھوم ہوتی ہے۔ اس کے ان گنت مداح بھی اس کے کلام کو زبانی یاد رکھتے ہیں۔ علاقے کے گویے موسیقی کی محافل میں اسی کلام کو گایا کرتے ہیں لیکن تحریر میں کبھی نہیں آتا۔ شاعر کی موت کے ساتھ ایک دو قرنوں کے بعد اس کا کلام بھی ختم ہو جاتا ہے اور نام بھی۔ پھر نئے زمانے کے ساتھ نئے شُعرا میدان میں آجاتے ہیں۔

صرف ایک پشتو ٹپہ پشتو شاعری کی وہ صنف ہے جو ان سب کُلیوں سے مستثنیٰ رہا ہے۔ اوّل تو اس لیے کہ آج بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ٹپّے ایسے ہیں جن کے کہنے والے کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ وہ اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ مزاج کے لحاظ سے سارے کے سارے پشتون شاعر ہیں۔ کیونکہ کہیں تو کسی کھیت میں کام کرنے والے کسان کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ ہل چلاتے چلاتے ترنگ میں آکر کچھ گانے لگتا ہے جس سے ایک نیا ٹپہ بن جاتا ہے۔ کہیں کوئی لکڑہارا جنگل میں لکڑی کاٹتے ہوئے ایسا کر لیتا ہے اور کبھی گھر میں بیٹھی ہوئی کوئی خاتون اپنے

جذبات اور احساسات کی ترجمانی کسی نئے ٹپے سے کرلیتی ہے۔ یہی ٹپے ہزاروں سال سے چلے آرہے ہیں اور آج بھی ان کی ابتدا کا علم کسی کو نہیں۔ ایک ٹپّہ ملاحظہ ہو

سپوږمیه کړنګ وهه را خیژه
یار مې د ګلو لو کوي ګوتې ریبینه !

(ترجمہ: اے چاند ! ایک جھماکے کے ساتھ نمودار ہو جا۔ میرا محبوب پھولوں کی کٹائی میں معروف ہے اور اندھیرے میں انگلیاں کاٹ رہا ہے)

پشتو شاعری کی بنیاد عروض پر نہیں سیلابوں پر ہے۔ ٹپے جتنے بھی ہیں، جس نے بھی کہے ہیں، ہر ٹپے کا فرد نو سیلاب کا اور مصرع تیرہ سیلاب کا ہوتا ہے۔ پشتونوں میں یہی صنف سب سے زیادہ مقبول ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ تحریری طور پر پشتو شاعری کا آغاز غور کے حاکم امیر کروڑ کی نظم سے ہوتا ہے جو ۱۳۹ ہجری میں لکھی گئی تھی لیکن پشتو شاعری میرے خیال میں پشتو زبان کے ساتھ ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے۔

پشتو شاعری کا پہلا دَور

تحریری ادب کا آغاز

یہ عجیب بات ہے کہ بقول مولانا عبدالقادر مرحوم آج کے پشتون کی پہچان تین باتوں سے ہے۔ اوّل یہ کہ وہ مسلمان ہے۔ دوم اس کی زبان پشتو ہے۔ سوم اس کا تعلق کسی قبیلے سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے پشتون کے لیے مسلمان ہونا شرطِ اولین ہے۔ جو مسلمان نہ ہو وہ پشتون نہیں ہو سکتا۔ ہونا بھی ایسا چاہیے تھا۔ کیونکہ پشتونوں کی متمدن شہری زندگی، سلطنت

ترقی اور ادبی آثار کا دور اسلام کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے اتنا کیا کہ اسلام کے متعارف ہوتے ہی سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ مگر اسلام نے ان کو سلطنت سے لے کر ادب تک وہ سب کچھ دیا جو اس سے پہلے ان کو نہیں ملا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں امیر کروڑ کی جو نظم ۱۳۹ھ ہجری میں لکھی گئی ہے اور پشتو کی ایک کتاب پٹہ خزانہ میں محفوظ ہے اس نظم کے ساتھ کتاب کے مؤلف نے تاریخ سوری کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس شاعر کا پورا نام امیر کروڑ جہان پہلوان ہے۔ اس کا تعلق سوری قبیلے سے تھا اور امیر پولاد کا بیٹا تھا۔ یہ پشتونوں کا ایک شاہی گھرانہ تھا جن کی حکومت موجودہ افغانستان کے غور کے علاقے میں قائم تھی۔ امیر کروڑ ایک مضبوط اور طاقتور آدمی تھا جو تن تنہا سو آدمیوں کے خلاف لڑا کرتا تھا۔ وہ ایک زبردست شاعر اور صاحبِ کلام تھا۔ اس کی جو نظم ہم تک پہنچی ہے اس کی بنیاد ملی اوزان پر ہے۔ اس کی پشتو دوسری زبانوں کے اثرات سے پاک ہے۔ بذاتِ خود اس نظم کے معیار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک پشتو زبان کی شاعری ارتقائی منازل سے گذر چکی تھی۔ ایسے معیاری کلام کے پس منظر میں شاعری کی ایک ارتقائی تاریخ ضرور ہوگی۔ حالانکہ ہمارے پاس اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں۔ امیر کروڑ کی نظم کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

زهٔ یم زمرے پہ دے نړئ لہ ما اتل نشتہ
پہ هند و سند و پر تخار او پر کابل نشتہ
بل پہ زابل نشتہ لہ ما اتل نشتہ
غشی د من ے حئ برینا پر میر خمنو باندے
پہ ژوبلہ یونم پر سر غالم پر تښتیدونو باندے
پہ ما تیدونو باندے تر ما اتل نشتہ'

(ترجمہ: میں شیر ہوں دنیا میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ بہادر نہیں ہے۔ نہ ہند میں نہ سندھ میں

نہ تخار میں اور نہ کابل میں ۔ نہ ہی زابل میں ۔ مجھ سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ۔ میرے تیر بجلی کی طرح دشمنوں کے جسم کے پار جاتے ہیں میں زخمی بھاگنے والوں کے سروں پر پیر رکھتا ہوں ۔ شکست کھانے والوں کے اوپر ۔ مجھ سے زیادہ بہادر کوئی نہیں[1])

یہ ایک لمبی نظم ہے جس کے لغات خاص پشتو کے ہیں ۔ اس نظم میں جو روانی اور ترنم ہے وہ موسیقی کے ایک خاص آہنگ کا ترجمان ہے ۔

اسی دور کا دوسرا شاعر ابو محمد[2] ہاشم سروانی ہے جو ۲۲۳ھ ہجری میں طلبند کے مقام پر پیدا ہوا جولبت کے علماء کا شاگرد تھا ۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ مشہور عربی ادیب ابن خلاد کا بھی شاگرد رہا تھا وہ عربی فارسی اور پشتو میں شاعری کرتا تھا اور اس زمانے کے کچھ عربی اشعار کا بھی پشتو میں ترجمہ کیا تھا ۔ ابو محمد ہاشم کے حالات کا پتہ بھی ہمیں کتاب پٹہ خزانہ سے چلتا ہے[3] ۔ ابو محمد ہاشم نے عربی سے اپنے استاد ابن خلاد کا جو ترجمہ پشتو شاعری میں کیا ہے وہ حسب ذیل ہے ۔

ژبه هم بنه وینا کاندی چه ئے ویه
دخاوند په لاس کښے زر او درهم ونه
ژبه ورورله ورځئ وینا ئے آوری
د درهم خاوندان تل وی په ویاروننه[4]

(ترجمہ : زبان سے اچھی باتیں تب نکلتی ہیں جب بولنے والے کے ہاتھ میں زر اور درہم ہوں ۔ مال دار لوگ ہمیشہ فخر کرتے ہیں کہ زبان دان ان کی باتیں سننے کے لیے چلے آتے ہیں ۔

---

[1] پٹہ خزانہ مؤلف محمد ہوتک صفحہ ۴۳ ۔
[2] د پشتو ادبیاتو تاریخ جلد ۲ ۔
[3] د پشتو ادبیاتو تاریخ (حبیبی) صفحہ ۸۹ ۔
[4] پٹہ خزانہ محمد ہوتک صفحہ ۵۰، ۵۹ ۔

کہتے ہیں کہ ابو محمد ایک عالم فاضل آدمی تھا جس نے عربی اشعار کی فصاحت اور بلاغت پر "دسالوُ وزمہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ ۲۹۷ھ ہجری میں فوت ہوا۔

امیر کروڑ اور ابو محمد ہاشم کے زمانے میں نوے سال کا فرق ہے۔ ان کے بیچ میں ایسا کوئی شاعر نہیں ملتا جس کے کلام کو سامنے رکھ کر تحریری ادب کے ارتقا کا جائزہ لے سکیں۔ حالانکہ امیر کروڑ کے شعر میں خالص پشتو کے علاوہ کسی دوسری زبان کا امتزاج نہیں۔ مگر ابو محمد ہاشم کی شاعری نہ صرف عربی زبان کے تراجم پر موقوف ہے بلکہ دونوں کے انداز میں بھی بہت فرق ہے۔

ابو محمد ہاشم سروانی کے بعد پشتو ادب کی تاریخ کے دھندلکوں میں ہمیں جس دوسرے شاعر کا پتہ چلتا ہے اس کا نام شیخ رضی ہے۔ جس کا تعلق پشتونوں کے لودھی قبیلے سے تھا۔ یہ بھی شاہی خاندان کا قبیلہ تھا۔ بعد میں ہندوستان پر سلطنت کے علاوہ لودھیوں نے ۳۵۱ھ ہجری سے ۳۹۰ھ ہجری تک ملتان پر حکومت کی ہے۔ ان دنوں اس خاندان کا سربراہ شیخ حمید لودھی تھا۔ اور شیخ رضی شیخ حمید کا بھتیجا تھا جو ایک دین دار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ یہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ ملتان میں رہتا تھا۔ چونکہ پشتو زبان کا عالم اور شاعر تھا۔ اسی وجہ سے اپنے چچا حمید لودھی نے اسے تبلیغ کے لیے پہاڑوں میں رہنے والے پشتونوں کے پاس بھیجا۔

کتاب پٹہ خزانہ کی وساطت سے اس کی شاعری کا جو نمونہ ہم تک پہنچا ہے اس میں شاعر نے اپنے چچازاد بھائی نصر لودھی کو الحاد کا رستہ اختیار کرنے پر بُرا بھلا کہا ہے اور اپنی خاندانی روایات کی مخالفت پر طنز کیا ہے۔ اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو؛

دالحاد پہ لور دے تر پلل   گروہ دے زمولیہ وکوراوہ[1]

موبز و نمرلے پہ زیاروند   تا پہ نتور ولتوراوہ ،

---

[1] پٹہ خزانہ محمد ہوتک صفحہ ۲۹۔

نصره نه‌مو ئې له کہالۀ   لودھی نه ئې په کاوۀ

(ترجمہ: تُو نے الحاد کا رستہ اختیار کیا۔ ہمارے گروہ کو بدنام کیا۔ ہم نے بڑی کوشش سے نام پیدا کیا تھا۔ تُو نے اس پر دھبہ لگایا۔ اے نصر! تُو ہمارے خاندان سے نہیں اور تیرا کردار لودھیوں جیسا نہیں)

شیخ رضی لودھی کے بعد اس زمانے کا دوسرا شاعر امیر نصر لودھی ہے۔ یہ امیر نصر لودھی شیخ حمید لودھی کا بیٹا اور شیخ رضی لودھی کا چچازاد بھائی تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق ملحد علما سے تھا جس کی وجہ سے الحاد کے رستے پر چل پڑا۔ جس کی بنا پر اپنے چچازاد بھائی شیخ رضی لودھی نے اُس پر طنز کیا تھا۔ جب اس تک اپنے چچازاد بھائی شیخ رضی لودھی کے اشعار پہنچے تو چونکہ وہ خود بھی پشتو کا شاعر تھا، جواب میں اس نے بھی پشتو کے چند اشعار لکھے۔

د الحاد په تور تورن شوم   ځه لرغون خو ملحد نه یم
زما د بلنۀ ھسې توره کړي   که ملحد یم دد نبنۀ یم،

(ترجمہ: مجھ پر الحاد کا دھبہ لگ گیا۔ میں پہلے تو ملحد نہ تھا۔ یہ الزام دشمنوں کا عائد کردہ ہے۔ مجھے دشمنوں نے ملحد بنایا ہے)

له اسلامه نه تر پلمه   تورانونه په تر پلۀ یم
د لودھی زوئې سُنتي یم   د حمید د لوړ کالۀ یم

(ترجمہ: میں اسلام سے نہیں بھاگتا۔ تورانیوں سے بھاگتا ہوں۔ لودھی خاندان کا اہل سنت بیٹا ہوں حمید کے اُونچے گھرانے سے میرا تعلق ہے)

پشتو ادب کے اس دور میں جو دوسرا شاعر یاد کیا جاتا ہے وہ روحانیت کا علمبردار بیٹ نیکہ ہے۔

ے پٹہ خزانہ۔ صفحہ ۱۱

شیخ بیٹنی یا بیٹ نیکہ ایک نیک اور بزرگ آدمی تھا اور اپنے قبیلے کا سربراہ تھا۔ اس کا ذکر سلیمان ماکو نے اپنی کتاب "تذکرۃ الاولیا" میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ تخت سلیمان کی پہاڑی پر رہتا تھا۔ ساری رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں معروف رہتا اور ان مناجات کا ورد کیا کرتا تھا۔

لویہ خُدایہ لویہ خُدایہ   ستا پہ مینہ پہ ھر ځایہ
غرولا پردے دړناوی کے   تولہ ژوی پہ زاری کیے
دلتہ دی دغرو لمنے   زموژ کیږدئ دی پکښے پلنے
داوګړی ډیر کړے خُدایہ   لویہ خدایہ لویہ خدایہ
دلتہ بز زموژ او ربل دے   وړکور کے دے وړ بور جل دے
مینہ ستا کښے موژ میشتہ یُو   بل دچا پہ ملۂ تلۂ نہ یُو
ھک آ ومزکہ نغنبہ ستادہ   دمیرو ودہ لہ ستادہ
داپالنہ ستادہ خُدایہ   لویہ خُدایہ لویہ خُدایہ

(ترجمہ: اے خدائے بزرگ و برتر! تیری محبت میں ہر جگہ پہاڑ شان و شوکت سے کھڑے سب تیرے آگے زاری کرتے ہیں۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں ہمارے خیمے نصب ہیں۔ اے خدا ان افراد کی تعداد زیادہ کر۔ اے خدائے بزرگ و برتر! یہاں ہماری تھوڑی تعداد ہے۔ چھوٹا گھر اور چھوٹا سا خاندان ہے۔ ہم تیری محبت کے سہارے زندہ ہیں۔ دوسرا کسی کا کوئی آسرا نہیں ہے۔ آسمان اور زمین دونوں تیرے ہیں۔ افراد میں بھی تو اضافہ کرتا ہے۔ اے خدا! سب تیری پرورش ہے۔ اے خدائے بزرگ و برتر! اے خدائے بزرگ و برتر!)

بیٹ نیکہ کے شعر کا ذکر کتاب پٹہ خزانہ میں موجود نہیں ہے۔ اس کے اشعار میں جو سادگی اور سلاست، خلوص اور محبت ہے۔ اپنے لوگوں سے اُسے جس قدر محبت ہے اس سے بیٹ نیکہ کی

سلہ پٹہ خزانہ۔ صفحہ۔

باطنی صفائی کا پتہ چلتا ہے ۔ بیٹ نیکہ تین سو اور چار سو ہجری کے درمیان زندہ تھے [1]۔

بیٹ نیکہ کے بعد دوسرا شاعر اس کا بیٹا اسماعیل سڑبنی ہے ۔ صدیق اللہ خاں رشتین اپنی کتاب "پشتو ادب کی تاریخ" میں رقمطراز ہے کہ چونکہ اس کی پرورش اپنے چچا سڑبن کے گھر ہوئی تھی اسی لیے اسے اسماعیل سڑبنی کہتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ اسماعیل سڑبنی سنہ ۴۰۰ ہجری کے حدود میں زندہ تھا ۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح پاک اور نیک آدمی تھا ۔ جو تخت سلیمان کی پہاڑی میں اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر تھا ۔ پشتو زبان کا شاعر تھا ۔ اس کا ذکر بھی سلیمان ماکو کے "تذکرۃ الاولیا" میں موجود ہے ۔

کتاب پٹہ خزانہ میں اس کے شعر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اپنے چچازاد بھائی خرشبون کے اپنے علاقے سے غوزہ مرغئ (غور) کی طرف کوچ کرتے وقت اس کی جدائی کے شدتِ احساس سے اسماعیل سڑبنی نے مندرجہ ذیل درد بھرے اشعار کہے تھے ۔

کہ یون دے یون دے	مخکنے بیلتون دے
لہ کمی غرہ څخہ ځی	خرشبون دے
کہ وروره و روره	خرشبون وروره
تہ چہ بیلتون کړے	زما ویر تہ گوره
دخدائے د پاره	خرشبون یاره
چہ هیر مو نہ کړے	زمونږ کہول واره
نهٔ مے رپیږی	یار مے بیلیږی
بیلتون ئے اور دے	ځان پرے سوزیږی

---

[1] "د پشتو ادب تاریخ" صدیق اللہ خاں رشتین

(ترجمہ: وہ جا رہا ہے، وہ جا رہا ہے۔ جدائی آنے والی ہے۔ تخت سلیمان کی پہاڑی سے خرشبون رخصت ہو رہا ہے۔ اے میرے بھائی! اے میرے بھائی! میرے خرشبون بھائی! تو جو جُدا ہو رہا ہے۔ میری گریہ وزاری دیکھ! میرے خرشبون یار! تجھے خدا کا واسطہ ہمارے خاندان کو بھول نہ جانا! میرا دل کانپ رہا ہے۔ میرا یار جُدا ہو رہا ہے۔ اس کی جُدائی ایسی آگ ہے جس میں جسم جل رہا ہے۔)

اسماعیل سڑبنی کے یہ اشعار بقول ڈاکٹر راج ولی خٹک سادگی اور بے ساختگی کا نمونہ ہیں۔ ان اشعار کا انداز قدیم پشتو شاعری کا ہے۔ اس زمانے میں احساس کے اظہار کے لیے یہی انداز اپنایا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اشعار آج کے فنی اصول کی روشنی میں ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھتے۔

یہ ایک سادہ اور براہ راست طور پر جذبات کا اظہار ہے۔ جس میں عوامی ادب کے کچھ اصناف کا تاثر جھلکتا ہے۔

اسماعیل سڑبنی کے بعد دوسرا نام خرشبون کا ہے جو اسماعیل سڑبنی کا چچازاد بھائی اور پشتونوں کے سڑبن قبیلے کے جدامجد سڑبن کا بیٹا تھا۔ جو سنہ ۱۴۰ ہجری میں زندہ تھا[1] اس کے اشعار اور حالات زندگی ہم تک کتاب پٹہ خزانہ کے حوالے سے پہنچے ہیں۔ پشتو ادبیات کی تاریخ میں آغائے حبیبی پٹہ خزانہ کے حوالے سے اس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ سڑبن کا بیٹا اور اور بیٹ نیکہ کا بھتیجا تھا اور اپنے گھرانے کا مشہور شاعر تھا۔ پشتونوں کے تین قبیلے اس کے تین بیٹوں کند، زمند اور کاسی کی اولاد ہیں۔ یہ بھی اپنے وقت کا بڑا بزرگ اور ولی تھا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ اپنے چچازاد بھائی اسماعیل سڑبنی سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ اس کے پیچھے بہت رویا تھا۔

---

[1] د پشتو ادبیاتو تاریخ (عبدالحی حبیبی) صفحہ ۱۱۲

اور روتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار موزوں کیے تھے۔ اسماعیل کے ان اشعار کے جواب میں جو اشعار غرشبون بابا نے کہے تھے وہ پٹہ خزانہ میں یوں نقل کیے گئے ہیں۔

بیلتانه ناره مې وسوه په کور باندې
نه پوهېږم چې به څه پېښ شي په وړاندې
له خپلوانو به بېلېږم په سرو سترګو
دواړه سترګې مې په وينو دي ژړاندې
اسماعیله ستا ناروې زړه سوری کې
بېلتانه غرشبون بیا له تا پردې کې

(ترجمہ: میرے گھر پر جدائی کا نعرہ اٹھا۔ پتہ نہیں آگے کو کیا پیش آئے گا۔ اپنوں سے تو روتی ہوئی آنکھوں سے جدا ہو رہا ہوں، میری دونوں آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ اے اسماعیل! تیرے نالہ و فریاد نے میرا دل زخمی کیا۔ جدائی نے تجھ سے غرشبون کو چھین لیا۔)[1]

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شعر کے کچھ اصناف موجود تھے۔ غرشبون کے ان اشعار کو غلوریز (مربع) کہا گیا ہے۔ جو شعر کی ایک مستقل صورت ہے۔

اس کے بعد دوسرا نام شیخ اسعد سوری کا ہے جو محمد کا بیٹا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ سوری خاندان کی حکومت کے دوران امیر محمد سوری کا ہم عصر تھا اور اس بادشاہ کا درباری شاعر تھا۔[2] اس کی رہائش علاقہ غور میں تھی۔ شیخ کتّہ کی روایت کے مطابق قدیم پشتونوں کے حوالے سے جو حالات کتاب پٹہ خزانہ میں شیخ اسعد سوری کے لکھے گئے ہیں اس کی رو سے وہ پشتو زبان کا ایک زبردست

---

[1] پٹہ خزانہ (محمد ہوتک)، صفحہ ۱۹۔

[2] یہ بادشاہت سوری خاندان کی غور (افغانستان) میں تھی۔

شاعر اور عالم تھا۔ محمد ہوتک پٹہ خزانہ میں لکھتا ہے کہ وہ آہنگراں میں رہتا تھا اور اس کی وفات زمینداور کے علاقے میں ہوئی ہے[1]۔ اس کے مرثیے کا ایک نمونہ یہ ہے

د فلک له چار وڅو کړم کوکار
زمولوی هر ګل چه خاندی په بهار
هر غټول چه په بید باغو ریدهٔ وکا
ریژوی ئے پاڼړے کاندی تار په تار
ویر مخونه د فلک څپیړے شنه که
ویر سرونه کا تر خاورو لاندے زار
څه تیرے څه ظلم کاندے اے فلکه
ستا له لاسه هیڅ ګل نهٔ دے بے له خار
دواکمن د سره خول پرے باسے مرشی
د بے وزلو وینے تویئے کاندے خونخوار

(ترجمہ: فلک کے کس کس کام کا گریہ کروں۔ یہ بہار کے ہر پھول کو جھاڑ دیتا ہے۔ جو گل لالہ بھی صحرا میں کھل جاتا ہے اُسے جھاڑ کر پتوں کو تار تار کر دیتا ہے۔ فلک کا تھپڑ بہت سے چہروں کو نیلا کر دیتا ہے اور بہت سے سروں کو مٹی کے نیچے دبا دیتا ہے۔ اے فلک! تو کیسی زیادتی اور ظلم کرتا ہے۔ تیری وجہ سے کوئی پھول بھی بے خار نہیں ہے۔ حکمران کے سر کا تاج مار کر گرا دیتا ہے اور خونخوار بے چاروں کا خون بہا لیتا ہے۔)

پشتو شاعری میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کلام ہے۔

---

[1] جناب صدیق اللہ رشتین نے پشتو ادب کی تاریخ میں کتاب پٹہ خزانہ کے حوالے سے اس کی وفات کا سال سنہ ۹۳۵ھ ہجری لکھا ہے۔

شیخ اسعد سوری کے بعد پشتو ادب میں اسی سلسلے کا دوسرا شاعر شیخ تیمن ہے ۔ اس کے اشعار بھی ہم تک کتاب پٹہ خزانہ کے واسطے سے پہنچے ہیں ۔ پٹہ خزانہ شیخ تیمن کے حالات شیخ بوستان بڑیچ کے حوالے سے یوں لکھتا ہے کہ یہ غور کے کجورہ نامی جگہ میں رہائش پذیر تھا اور سلطان علاءالدین حسین کے زمانے میں سنہ ۵۰۰ سے سنہ ۵۵۰ ہجری کے درمیان فوت ہوا ہے[1]۔ اس کا تعلق پشتونوں کے کاکڑ قبیلے سے تھا ۔ پٹہ خزانہ میں شیخ تیمن کے اشعار یوں درج ہیں ۔

کیژ رنړا د نمر خپره شوه
زما په کور د ویر ناره شوه
د بیلتون ورځ توره تیاره شوه
ږغ شو ناڅاپه چه بیلتون راغے

(ترجمہ : صبح سورج کی روشنی پھیلی ۔ میرے گھر سے آہ و بکا کی آواز اٹھی ۔ جدائی کا دن اندھیری رات میں بدل گیا ۔ اچانک آواز آئی کہ جدائی آگئی ۔)

چار بندوں کی یہ نظم پشتو کے عوامی ادب کے اوزان سے مشابہ ہے ۔

شیخ تیمن کے بعد غوریوں کے دربار کا دوسرا شاعر تیمنی ہے جو سلطان غیاث الدین غوری کا درباری شاعر تھا ۔ اس کا زمانہ سنہ ۵۶۰ ہجری کا ہے ۔ اس نے اپنے بادشاہ کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں وہ پشتو مثنوی کے پہلے اشعار سمجھے جاتے ہیں[2]۔

نن زهٔ غزیږم په صفت د سلطان   چه دے بادار غازی ملک د جهان
د فیروزکوه اوغور ورغړ لہ دهٔ ده   هم د تیر و تور و بریښنا لہ دهٔ ده

---

[1] د پښتو ادب تاریخ ۔ صفحہ ۱۲ (رښتین)

[2] پی ۔ ایچ ۔ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۴۸ ۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ۔

(ترجمہ: آج میں سلطان کی تعریف کرتا ہوں جو جہان کا بادار، غازی اور ملک ہے۔ فیروز کوہ اور غور کی روشنی اسی کے دم سے ہے اور تیز تلواروں کی چمک بھی اُسی کی وجہ سے ہے۔)

درباری شاعری کی یہ روایت تیمنی کے بعد شکارندوئے نے بھی بحال رکھی ہے۔ شکارندوئے شہاب الدین غوری کا درباری شاعر تھا۔ جس کا زمانہ سال ۵۸۰ھ ہجری ہے۔ کتاب پٹہ خزانہ میں تاریخ سوری کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ کتاب تاریخ سوری محمد بن علی نے لکھی تھی۔ جس نے اس زمانے میں بسط میں شکارندوئے کے قصیدوں کی ایک کتاب خود دیکھی تھی۔ شکارندوئے کی شاعری کا جو نمونہ پٹہ خزانہ میں درج ہے وہ شہاب الدین غوری کی تعریف میں ہے۔

دلسپرلی بنکلونکی بیاکړه سنګارونه
بیائے ولونل پہ غرونو کښے لعلونه
مزکہ شنہ بناخونہ شنہ لمنے شنے شوے
طلستان زمردی واغوستہ غرونہ

(ترجمہ: بہار کے حسن نے پھر سنگار کیا۔ پھر سے پہاڑوں میں لعل بکھیر دیے۔ زمین سبز، شاخ سبز اور دامن سبز ہوئے۔ پہاڑوں نے طلستان زمردی پہن لیے۔)

اس قصیدے میں پینتالیس ابیات ہیں جو فنی خوبیوں کے اعتبار سے جامع اشعار کا نمونہ ہیں۔

پشتو ادب کے سلسلے میں شکارندوئے کے بعد ملک یار غرشین کا نام آتا ہے۔ غرشین پشتونوں کا ایک مشہور آستانہ دار قبیلہ ہے۔ ملک یار اسی قبیلے کا ایک بزرگ آدمی تھا۔ اس کا ذکر سلیمان ماکو نے "تذکرۃ الاولیا" کے صفحات میں کیا ہے۔ غازی شہاب الدین غوری کے ایک جہاد کے

موقع پر اس نے کچھ اشعار کہے تھے۔ جس وقت کہ پشتون پسپا ہو رہے تھے تو ملک یار کے ان اشعار کی برکت سے آگے بڑھے اور دشمن پر فتح حاصل کی۔

خښتن مو مل دے اوس خو یرغل دے   هیواد د بل دے
غازیانو گورئ خښتن مومل دے

(ترجمہ: اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تم جھپٹ کر دشمن پر حملہ کرو۔ یہ پرایا ملک ہے مگر غازیو دیکھو! اللہ تمہارے ساتھ ہے۔)

سلیمان ماکو نے "تذکرۃ الاولیا" میں ملک یار غرشین کا سال ۵۸۱ھ ہجری لکھا ہے۔

اس کے علاوہ جن دوسرے شعرا نے پشتو شاعری میں وقتاً فوقتاً اپنا کمال دکھایا ہے ان میں قطب الدین بختیار کاکی (۶۲۳-۶۳۴ ہجری) شیخ متی (۶۸۸ ہجری) بابا ہوتک (۶۶۱-۷۴۰ ہجری) شیخ ملک یار (۷۴۹ ہجری) اکبر زمینداوری (۷۷۱-۸۰۷ ہجری) زرغون خان (۸۲۱-۸۹۱ ہجری) سلطان بہلول لودھی (۸۹۴ ہجری) خلیل خاں نیازی (۹۰۰ ہجری) شیخ محمد صالح (۹۰۰ ہجری) میرمن رابعہ (۹۰۰ ہجری) بابر خاں کاکڑ (۹۰۳ ہجری) دوست محمد کاکڑ (۹۰۳ ہجری) میرمن زرغونہ (۹۰۳- ہجری) جیسے نامور شعرا نے اپنے اپنے زمانے میں پشتو کے شعر و ادب کو ترقی دی ہے۔

یہاں تک پشتو شاعری کا پہلا دور تھا۔ یہ لوگ تاریخ کے اس دور میں گذرے ہیں جس کا ادب اب تک اندھیرے میں ہے۔ جن لوگوں کے تحریری آثار موجود ہیں گذشتہ صفحات میں صرف ان کا ذکر کیا گیا۔ اس دور میں ان شعرا کے ساتھ ان پشتون امرا اور شاہی گھرانوں کا بھی حصہ ہے جن کی سرپرستی سے اکثر اوقات پشتو ادب نے ترقی کی ہے۔ ان خاندانوں میں قابل ذکر نام سوری، لودھی اور غوری ہیں۔

اس دَور کے جتنے شعرا کا بھی ذکر ہوا ہے وہ سب "پٹہ خزانہ" اور "تذکرۃ الاولیا" کے حوالے سے ہے۔ اس دور کی پشتو شاعری میں دو رویتے بالکل واضح ہیں۔ اوّل پشتو زبان کو بیرونی زبانوں کے اثرات سے پاک رکھنا اور دوسری بات مختلف زبانوں سے استفادہ کرنا۔ امیر کروڑ کے قصیدے میں شعوری طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ صرف پشتو الفاظ استعمال کیے جائیں۔ ورنہ جیسے کہ امیر کروڑ کے نام کے ایک حصے سے پتہ چلتا ہے ان دنوں پشتونوں کے علاقے تک عربی کا اثر پہنچ چکا تھا اور اسی اثر کے تحت کروڑ اور پولاد نے اپنے ناموں کے ساتھ امیر کے لقب کا استعمال قابلِ فخر سمجھا تھا۔ امیر کروڑ کے مقابلے میں ابو محمد ہاشم (۳۳۲ ہجری) کے شعر میں خاوند، زر اور درہم میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں سے دو فارسی اور ایک عربی کا ہے۔ شیخ رضی کے ایک شعر میں الحاد عربی اور کرد فارسی لفظ ہے۔ پھر دوبارہ بیٹ بابا کی مناجات میں خالص پشتو الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہی رجحان اسماعیل سڑبنی کے کلام میں بھی ہے۔ اسعد سوری کے مرثیے میں جو اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ان میں فلک، بہار، زار، ظلم، خار اور خونخوار جیسے غیر پشتو الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ شیخ تیمن کی شاعری خالص پشتو کی ہے۔ مگر تیمنی نے پھر صفت، غازی، ملک عربی الفاظ اور جہان، کوہ فارسی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اسی لیے یہ نکتہ مدِ نظر رہنا چاہیے کہ اس زمانے میں بھی زبان کو خالص رکھنے اور دوسری طرف دیگر زبانوں سے استفادہ کرنے کی شعوری تحریکیں جاری تھیں۔[1]

پشتو شاعری کا دُوسرا دَور

روشانیہ اور درویزہ تحریکیں

پشتو شاعری کے پہلے دور کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اس کا دوسرا دور جب پشتو شاعری کا

---

[1] مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ، صفحہ ۵۵۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

نہیں پشتو زبان وادب کا دور کہا جا سکتا ہے بایزید انصاری سے شروع ہوتا ہے جس نے اپنی کتاب "خیر البیان" چار زبانوں پشتو، ہندی، فارسی اور عربی میں لکھی۔ حافظ عبدالقدوس قاسمی صاحب نے "خیر البیان" کے دیباچے میں بجا طور پر دعویٰ کیا ہے کہ یہ پشتو نثر کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔ جس کی نثر مسجع و مقفیٰ ہے۔ مگر ہم اسے شاعری کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ بایزید کے مقابلے میں اس کے حریف اخون درویزہ نے "مخزن" نامی کتاب لکھی۔ اس نے بھی پشتو نثر میں کسی حد تک بایزید انصاری کا رنگ اپنایا۔ پشتو شاعری کا اصل دور بایزید انصاری کی اولاد اور پیروکاروں، ساتھ ہی اخون درویزہ کی اولاد اور پیروکاروں سے شروع ہوتا ہے۔

بایزید انصاری مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے کا آدمی تھا۔ بایزید انصاری کے خلفا میں سے اکثر صاحبِ بصیرت علما اور شاعر تھے۔ جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بایزید انصاری کی تحریک کو دوام بخشا۔ بایزید کے مکتبِ فکر کے فلسفے کی اشاعت کے علاوہ ان لوگوں نے پشتو زبان و ادب کی ترقی کے لیے بہت سے کارنامے انجام دیئے[1]۔

بایزید انصاری کے خلفا میں جو شاعر گذرے ہیں ان میں پہلا نام ارزانی کا آتا ہے۔ ارزانی بایزید انصاری کے پشتو ادب میں نئے مکتبِ فکر کا نمائندہ ہے اور پشتو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس مکتبِ فکر کے بارے میں عبدالحیٔ حبیبی صاحب نے اپنی کتاب "پښتانہ شعرا" کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ "بایزید بن عبداللہ جو پیر روشان کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے پشتو ادب میں ایک نئے سبک کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ اس کے کچھ ساتھی اور مرید بھی تھے۔ جنہوں نے عروضی شاعری میں اپنی زبان کی خدمت کی۔ روشانیہ سبک ان ممیزات کی بنا پر دوسروں سے الگ ہے۔ اس گروہ

[1] ان میں مشہور نام مُلّا ارزانی، مرزا خان انصاری، علی محمد مخلص، دولت لوانڑی، واصل روشانی، کریم داد روشانی۔ انکے علاوہ خلفا میں پائندہ خان، حسن خان اکوزئی، ملا دولت خان مہمند زئی، مُلّا محمود اور خلیفہ یوسف وغیرہ ہیں۔

کے شعرا نے کئی اصناف میں شاعری کی۔ جیسے غزل، قطعہ، رباعی اور لمبے لمبے قصیدے۔ اس طرح سے انہوں نے پشتو زبان کا دامن پھیلایا اور تعریف، آہ و زاری اور اپنے باقی مسلکی بحثوں میں لمبے لمبے قصیدے لکھے۔[1]

بایزید انصاری کی مذہبی تحریک نے پشتو ادب کو بھی ایک نئی تحریک دی۔ اس تحریک میں قابلِ ذکر لوگ ارزانی، مخلص، مرزا خاں انصاری، دولت لوانڑی، واصل اور کریم داد روشانی ہیں۔ ان لوگوں نے پیر روشان کا تصوف اور فلسفہ پشتو ادب کے ذریعے پھیلایا۔ تصوف کے اس فلسفے پر وحدت الوجود کا رنگ غالب ہے۔ مگر وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے اشعار میں احکام شرعی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ احکام شرعی کے علاوہ راہِ سلوک کے باقی مقامات اور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور طریقت کے مراتب کا بیان اور تشریح بھی کرتے ہیں۔ ان میں ایک واضح بات پیر کامل کی حیثیت سے پیر روشان کے تتبع اور اہمیت پر بھی زور دینا ہے۔ یہ لوگ اپنے زمانے میں پشتو ادب پر چھائے ہوئے تھے اور پشتو کی ادبی تحریک کے رستے میں شعوری طور پر یہ خیال مدنظر رکھا ہے کہ پشتو کو ایک علمی زبان بنا سکیں۔[2]

حبیبی صاحب نے اپنی کتاب پشتانہ شعرا میں لکھا ہے کہ "ان لوگوں نے عرفان اور لاہوتی دنیا کی اصطلاحات پشتو زبان میں سمو دیے اور تصوف کے مشکل مسائل پر اشعار لکھے۔ جیسے وحدت الوجود وحدت الشہود کے مسائل اور تصوف کے روحانی لذات الہام اور ماوراء المادہ فلسفہ وغیرہم۔ ان سب کا استعمال انہوں نے اپنی غزلوں، قصیدوں اور اشعار کا حصہ بنایا۔[3] تشبیہ، استعارہ اور شاعرانہ

---

[1] پشتانہ شعرا۔ دوسرے ٹوک صفحہ ۲۲ (عبدالحی حبیبی)

[2] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۹۴ (ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک)

[3] پشتانہ شعرا جلد اول۔ صفحہ ۲۳ (عبدالحی حبیبی)

تلازمات سے سابقین کے برعکس اپنے اشعار کو صنعت اور براعت سے مزین کیا۔ بدیع اور بیان کے فنون کی مراعات پشتو زبان میں پہلی دفعہ استعمال کیں۔

روشانی دور کے شُعرا کے سامنے واضح مقصد یہ تھا کہ پشتو زبان کو نئی نئی علمی اصطلاحات دیں، اپنے اشعار کے ذریعے پشتونوں کو اپنے فلسفے سے آگاہ کریں اور اپنے مکتب فکر کو ترقی دے کر پشتو زبان کو باقی علمی زبانوں کے ہم پلہ بنادیں۔ ورنہ ان کی باقی تصنیفات سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ پشتو کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اگر انہیں پشتو کی ترقی کا احساس نہ ہوتا تو وہ باقی مروجہ زبانوں میں دوسرے لوگوں کی طرح اپنا اظہار خیال کرتے[1]۔

بایزید انصاری کے مکتب فکر کا پہلا شاعر ارزانی ایک عالم فاضل آدمی تھا۔ پشتو زبان کا اچھا شاعر تھا۔ مُلّا ارزانی کے نام سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے کلام کے زیادہ حصے میں شرعی احکام کے بیان کے علاوہ سلوک اور معرفت کے رموز و اسرار کا بھی بیان ہے قبیلے کے لحاظ سے زمند اور زمند میں اس کا تعلق خوشکی شاخ سے ہے۔ اس کے شعر کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اپنے ہم مسلک شعرا مرزا خاں انصاری، مخلص اور دولت کے علاوہ خوشحال خاں خٹک اور رحمٰن بابا نے بھی شاعری کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ارزانی بایزید انصاری سے بیعت کرنے سے پہلے قصور میں رہتا تھا۔ جب بایزید کی دعوت عام ہوئی تو اس نے بھی آکر اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد واپس قصور چلا گیا اور نہایت جوش و خروش سے اپنے پیر کی تعلیمات کی تبلیغ شروع کی۔ چونکہ یہ عالم فاضل آدمی تھا۔ اس لیے اس کی بیعت سے بایزید انصاری کے مشن کو تقویت ملی۔ اس کی علمیت کی وجہ سے اخون درویزہ نے یہ افواہ پھیلائی کہ خیر البیان کی تحریر میں ارزانی کا بھی ہاتھ ہے بلکہ بایزید نے ارزانی کی مدد سے

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۴۵ (ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک)

خیرالبیان" لکھی ہے اور یا یہ کہ خیرالبیان میں ارزانی کا حصہ ہے۔ مگر یہ باتیں تعصب کی ہیں[1]۔

ڈاکٹر میر ولی خان محسود نے "مقصود المومنین" کے انگریزی ترجمے میں آگے لکھا ہے کہ لوگوں کی یہ بات غلط ہے کہ ملا ارزانی نے بایزید کے لیے "خیرالبیان" میں کچھ کمی زیادتی کی ہے اس لیے کہ ایک تو اس بات کا کوئی تحریری ثبوت نہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر ارزانی ایسا کام کرتا تو بقول اخون درویزہ جب وہ بایزید انصاری کے مسلک سے منحرف ہوا تو اس بات کا برملا اعلان کرتا۔ مگر نہ تو اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت ہے کہ ارزانی بایزید انصاری کے مسلک سے منحرف ہوا تھا اور نہ اس کا کہ اُس نے "خیرالبیان" کا کچھ حصہ لکھا تھا۔

ارزانی نے بایزید انصاری سے بیعت اس وقت کی تھی جب وہ شمالی وزیرستان کے علاقہ دوڑ میں تھا اور اس وقت تک بایزید انصاری نے اپنے دینی فلسفے کی تبلیغ عام کی تھی۔ اسی ضمن میں "حالنامہ" کا بیان درست معلوم ہوتا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ جب بایزید انصاری نے ارزانی کی بیعت قبول کی تو اُسے اپنے مشن کے فروغ کے لیے ہند بھیجا۔ چونکہ حالنامہ میں ان سب لوگوں کا ذکر ہے جو پہلے بایزید کے ساتھی تھے اور بعد میں منحرف ہوئے اس لیے اگر ارزانی کے دیوان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آخری دم تک نہ صرف بایزید کے مسلک کا ساتھی تھا بلکہ اس کا پُرزور مبلغ تھا۔ وہ فارسی اور پشتو کا شاعر تھا۔ اس کے علاوہ "مراد المحققین" نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ صدیق اللہ رشتین نے پشتو ادبیات کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ارزانی نے ایک مستقل کتاب "چار رسالہ چار مان" بھی لکھی تھی[2]۔

---

(1) English translation, Introduction of Maqsood-ul-Momineen (By Dr. Mir Wali Khan Masood) Page-27.

[2] د پشتو دادب تاریخ صفحہ ۲۸ (رشتین)

مناسب ہوگا کہ ارزانی کے دیوان[1] سے ان اشعار پر بحث کی جائے جن میں وہ پشتو زبان کا ذکر کرتا ہے اور جن سے پشتو زبان کی ترقی کے سلسلے میں اس کے شعوری میلان کا پتہ چلتا ہے[2]۔ دیوان کے شروع میں جو غزل حمد کی صورت میں لکھی گئی ہے اس کا مقطع ہے۔

ارزانی پہ پښتو وکو ېښ
دا غزل نادر رښتیا

(ترجمہ: سچ تو یہ ہے کہ ارزانی نے پشتو میں یہ نادر غزل لکھی۔)

ایک دوسری غزل میں لکھتا ہے۔

کہ توفیق مے حق نصیب کہ
زۀ بہ کښم د حق ثنا
یو دیوان پہ پښتو ژبے
پر دیرش حرف کرم بنا
بل یادگار بہ مے شی پاتو
د پښتو رښتیا وینا
ارزانی پہ پښتو وائی،
صدقنا و آمنا،

(ترجمہ: اگر حق مجھے توفیق دے تو میں اس کی ثنا لکھوں گا۔ پشتو زبان میں تیس حرف کا ایک دیوان بنا دوں گا۔ اس طرح پشتو زبان میں حق گوئی کی میری یادگار باقی رہ جائے گی۔ ارزانی پشتو زبان

[1] یہ دیوان پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کی لائبریری میں مخطوطہ کی صورت میں موجود ہے۔

[2] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۹۹۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

میں صدقا ر آمنا کہتا ہے)

ارزانی کے بعد مرزا خاں انصاری وہ شاعر ہے جس نے روشانیہ تحریک کو بہت تقویت دی ہے اور آنے والے روشانیہ شعرا کے لیے وحدت الوجود کے مشاہدے اور بیان کے طریقے آسان کیے ہیں۔[1]

مرزا خاں انصاری تصوف میں جن تجربات سے گذرا ہے اس کا بیان بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ روشانیہ مکتبِ فکر میں ارزانی نے اپنی پوری شاعری مختصر بحر میں کی ہے۔ لیکن مرزا خاں انصاری نے غزل میں لمبے، مختصر اور مختلف بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ مرزا خاں انصاری کے کلام کی روشنی میں ہمیں دو واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔ اوّل روشانیہ فلسفے کی اشاعت اور دوسرا پشتو زبان کی ترقی۔ مرزا خان انصاری، بایزید انصاری کا پوتا اور نورالدین کا بیٹا تھا۔ ۹۸۸ھ ہجری کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ اس کی ولادت کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں ہے لیکن اس کی شہادت کی تاریخ دولت لوانڑی کے ایک قصیدے کی رو سے ظاہر ہے۔

د دکن په جنګ شهید شو خوشندوا وسه

په تاریخ د زر څلویښت د ده ګذر وو[2]

(ترجمہ: دکن کی جنگ میں شہید ہوا۔ اللہ اُسے جنت نصیب کرے۔ وہ ۱۰۴۰ھ ہجری میں شہید ہوا)

روشانیہ تحریک کے افراد میں بعض وجوہات کی بنا پر مرزا خاں انصاری کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد آنے والے روشانیہ شعرا نے شعر کا معیار اسی کا قبول کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ پہلا پشتون شاعر ہے جس نے کامیابی سے پشتو غزل میں وحدت کا پورا فلسفہ

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۱۰۸۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

[2] دولت لوانڑی دیوان۔ د پښتو ټولنه کابل چاپ۔

سوم اور تیسری بات یہ کہ وہ نہ صرف وحدت الوجود کی تائید میں دلائل لایا ہے بلکہ اس نے دوسرے نظریات سے اختلاف بھی کیا۔ وہ بایزید انصاری کا پوتا اور اس کے مسلک کا پرزور مبلغ ہے۔ اس نے بایزید انصاری کو دادا سے زیادہ پیر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ اس کا کلام ملاحظہ ہو۔

مرزا لچنپله هیڅ و یلی نه دی
په قفس کښې د وحدت طوطی آواز که

(ترجمہ: مرزا نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہا ہے۔ وحدت کا طوطی ہے جو قفس میں بول رہا ہے۔)

د مرزا په خله وشینږم
یو روښان بے مثله زه یم

(ترجمہ: میں ایک بے مثل روشان (بایزید انصاری) جو مرزا کی زبان سے بولتا ہوں۔)

په وحدت له هر وجوده یکانه یم
په کثرت کښې د مرزا په خله وئیږم

(ترجمہ: وحدت میں ہر وجود کے ساتھ یگانہ ہوں۔ کثرت میں مرزا کی زبان سے بات کرتا ہوں۔)

پشتو زبان کے ساتھ انس سے متعلق مرزا خاں انصاری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

په ظاهر به د باطن په حال پوهیږی
مرزا وینا پښتو او معنی خاص

(ترجمہ: مرزا کے پشتو کلام کے خاص معنی کو سمجھنے کے بعد ظاہر سے باطن کی سمجھ آجاتی ہے۔)

اے مرزا په حقیقت د حق ثنا کره
ښه پښتو وینا عجب په دا نمط

(ترجمہ: اے مرزا حقیقت میں حق کی ثنا کیا کرو۔ اور اسی طرح خوبصورت پشتو کلام لکھا ہے۔)

اے مرزا لہ اهله اهل فائده مومی
د اپښتو وينا ساده معنی دقيق

(اے مرزا ! اہل سے اہل کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ پشتو کا کلام سادہ ہے لیکن معانی دقیق ہیں۔)

روشانیہ تحریک کا دوسرا نامور شاعر علی محمد مخلص ہے۔ اس نے پشتو غزل اس انداز میں کہی کہ اسے فارسی غزل کے قریب لا کھڑا کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں خاص وجوہات کی بنا پر اس کے کلام کو اشاعت نہ ملی لیکن بعد میں خوشحال خان خٹک اور اس کے بعد کے شعرا نے اس کے کلام پر رائے زنی کی ہے۔ مؤرخین میں قاسم علی خان آفریدی نے مخلص کی شاعری کا ذکر یوں کیا ہے۔

مهر علی عبدالقادر که سکندر وو
که اشرف که ارزانی مخلص جدا

(ترجمہ : مہر علی عبد القادر تھا یا سکندر۔ اشرف تھا کہ ارزانی یا مخلص۔)

مخلص بھی بایزید انصاری کا مرید تھا اور اپنے پیر کے حق میں روشانیہ مسلک کے دوسرے ساتھیوں کی طرح محبت و خلوص رکھتا تھا۔ یہ مرزا خان انصاری کا ہم عصر تھا۔ علی محمد مخلص کی زندگی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ اخوند درویزہ نے اسے ملا ارزانی کا بھائی بتایا ہے[1]۔ اس نے حالنامہ کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ حالنامہ میں لکھتا ہے کہ یہ فقیر مسکین علی محمد ابن ابوبکر قندھاری بایزید انصاری کے خاندان کا خدمتگار۔ اس کا کلام ملاحظہ ہو۔

د مخلص وينا پښتو دے
په آيت دے موافق

(ترجمہ : مخلص کا کلام پشتو ہے جو آیت کے موافق ہے۔)

---

[1] د پښتو ادب تاریخ صفحہ ۳۸ (صدیق اللہ رشتین)

د مخلص کلام قالب د پیر کامل دے
په قالب کښې د استاد تمام رغیږه
(ترجمہ : مخلص کا کلام پیر کامل کا قالب ہے ۔ استاد کے قالب میں تمام تر سمو جاؤ ۔)

د خدائی گفتار ئے خلهٔ تینگه تړلے
په غیبت فحش کلام ئے خلهٔ فراخه
(ترجمہ : خدائی گفتار تو اس کے منہ سے نہیں سنی جاتی ۔ غیبت اور فحش کلام کے لیے اس کا منہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے ۔)

اپنے کلام کے بارے کہتا ہے ۔

د مخلص خبرے پند وی له قرآن
مه ئے گوره د شاعر و قیل و قال ته
(ترجمہ : مخلص کی باتیں قرآن سے لی گئی ہیں ۔ تم شاعرانہ قیل وقال میں مت الجھو ۔)

روشانیہ تحریک کا اگلا سرگرم رکن شاعر دولت اللہ ہے ۔ روشانیہ ادب کو مرزا خاں انصاری اور مخلص جیسے شعراسے جو فروغ ملا وہ دولت کی وجہ سے اور آگے بڑھا جو شعری اصناف مقدمین روشانیہ مکتب فکر کے ادب کا تھا یعنی تصوف اور وحدت الوجود کا مخصوص روشانیہ فلسفہ ۔ دولت اس مکتب فکر میں مرزا خاں انصاری کا شاگرد اور ایسا لگتا ہے کہ اس نے مخلص سے بھی کافی استفادہ کیا ہے[1] ۔ وہ مرزا خان انصاری سے شاگردی اور مخلص سے دوستی اور ہم مسلک ہونے کا رشتہ بتاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

مرزا گنج را ته فیل کوره بنو غنی شوم
بیهوده منت به ولے د بل چا کړم

---

[1] پښتانہ شعرا ۔ صفحہ ۹۲ ۔ آکاشے حبیبی ۔

محقق وحدت کان د تصوف وو
په رموزئے په هر عالم دانا کړم
(ترجمہ: مرزا نے اپنے گھر میں خزانے سے آشنا کر کے مجھے غنی بنا دیا۔ فضول دوسروں کا احسان کیوں اٹھاؤں؟۔ وہ وحدت کا محقق اور تصوف کی کان تھا۔ اس نے مجھے علم کے تمام رموز بتا کر دانا کر دیا۔)

دولت کا پورا نام دولت اللہ ہے۔ اس کا تعلق لوانڑی یا لوہان قبیلے سے ہے۔ روشانیہ مسلک کا پرجوش حامی ہے۔ وہ تہمتیں اور الزامات جو روشانیہ مسلک رکھنے والوں کے خلاف لگتے تھے اور جو غلط فہمی مذہب کے سلسلے میں بایزید انصاری کے مسلک کے خلاف پیدا کی گئی تھی اور روشانیہ مسلک کے ان علما اور شعرا نے کافی حد تک اس کی تلافی کی۔ دولت نے اپنے کلام میں واضح کیا کہ روشانیہ مسلک والے گمراہ نہیں تھے۔ وہ پکے سُنّی مذہب تھے لیکن عام لوگوں کی بے علمی کی وجہ ان کے مخالفین نے غلط فہمیاں پیدا کی تھیں۔ وحدت الوجود اور روشانیہ طریقے کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ ادب میں مرزا خان انصاری کے مقام کا تعین بھی کرتا ہے اور باقی روشانیہ مسلک کے شعرا کے کلام پر تبصرہ اس کے ادبی شعور کی نشان دہی کرتا ہے[1]

مرزا ے ارزانی بے مخلص یار ہ
بل شاعر برابر نہ دے پښتون تا لو
(ترجمہ: مرزا۔ ارزانی اور مخلص کے علاوہ دوسرا کوئی پشتون شاعر بھی تیرا ہم پلہ نہیں ہے۔)
د بنیګړے غبز ئے خور کړ په جهان کښے
په پښتو شعرئے پُر عرب عجم کړ

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۱۲۸۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

(ترجمہ: اس نے دنیا بھر تک بھلائی کی آواز پہنچائی۔ پشتو شعر سے عرب اور عجم کو آشنا کیا۔)

لہ خپل کام سرہ دوستی نہ کہ کم اصل

چہ واصل تہ رجوع لری اصیل وی

(ترجمہ: جو بد اصل ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کے ساتھ دوستی نہیں رکھتے۔ اصیل وہ ہوتے ہیں جو اپنی اصل کی طرف رجوع کریں۔)

خوشحال خان خٹک نے دولت کے مقام کا تعین یوں کیا ہے۔

بل دولت فقیر درے پاوہ

زہٗ ترِ څو شیر شاهی تیر

(ترجمہ: دولت فقیر کا وزن تین پاؤ ہے۔ میرا وزن اس سے چند شیر شاہی زیادہ ہے۔)

دولت خوشحال خان خٹک کا ہم عصر ہے لیکن عمر میں خوشحال خان خٹک سے کافی بڑا ہے اس کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں ہے۔ حبیبی صاحب نے اپنی کتاب پښتانہ شعرا میں اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۰۰۰ ہجری کے لگ بھگ لکھی ہے۔ جبکہ اس کی زندگی کے شواہد سنہ ۱۰۵۸ ہجری کے بعد بھی پائے جاتے ہیں۔ حبیبی صاحب نے اپنی کتاب "پښتانہ شعرا" میں یوں لکھا ہے "دولت نے دکن کی جنگ میں مرزا خان انصاری کی وفات اور الہداد کی موت کی جو تاریخ بتائی ہے اس سے اس کی زندگی کا زمانہ اور اشعار کا دور یوں معلوم ہوتا ہے۔

د دکن پہ جنگ شهید شو خوشنو داو سہ

پہ تاریخ د زرخلوبنت کښے تے گزروو

(ترجمہ: وہ (مرزا خاں انصاری) دکن کی جنگ میں شہید ہوا۔ اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ اس کی وفات سنہ ۱۰۴۰ ہجری میں ہوئی۔)

پہ یوہ آہ ئے ارواح لہ تنہ بیل شو
پہ تاریخ دغین او نون حے تے سفر وو

(ترجمہ: ایک آہ سے اس کی روح تن سے جدا ہو گئی۔ اس نے غ۔ ن۔ ح کی تاریخ کو سفر کیا۔)

آخری سن جو اُس کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے وہ ۱۰۵۸ھ ہجری ہے۔ چالیس سال تک اس کی عمر یقینی طور پر اس کے اپنے ایک شعر سے ظاہر ہے۔

زۂ هلک وم افسانہ وم لہ عالمہ بیگانہ وم
تر څلوېښتو کالو تیر شوم بیگانہ یم لا تر اوسہ

(ترجمہ: جب میں لڑکا تھا تو افسانہ تھا، عالم سے بیگانہ تھا۔ اب میری عمر چالیس سال سے زیادہ ہوئی ابھی تک بیگانہ ہوں[1]۔)

اس کے بعد واصل کا نام آتا ہے جو روشانیہ مسلک کا پیروکار تھا اور اسی طریقے کے سلسلے کے متاخرین میں سے ہے۔ وہ بھی اپنے مکتبِ فکر کی طرح وحدت الوجود کا قائل ہے۔ وہ یقینی طور پر ۱۰۵۵ھ ہجری اور ۱۰۶۳ھ ہجری کے دوران زندہ تھا۔ اس لیے کہ دلبستان مذاہب کے مؤلف نے روشانیوں کی بابت معلومات واصل سے حاصل کی تھیں۔ پس اگر دبستان مذاہب کی تالیف ۱۰۵۵ھ اور ۱۰۶۳ھ ہجری کے درمیان ہوئی ہے تو واصل بھی اسی دور میں زندہ تھا[2]۔

واصل کے چند اشعار ماضی قریب میں کابل کی پشتو اکیڈمی کو پروفیسر عبدالشکور رشاد کے واسطے سے قندہار کے غریب وقف کتب خانے سے وصول ہوئے تھے جو چھاپ دیے گئے ہیں۔

---

[1] پښتانہ شعرا صفحہ ۸۸ (آقائے حبیبی)

[2] مقدمہ واصل روښانی څو شعرونہ۔ پوہاند رشاد

اس کلام کی روشنی میں واصل روشانیہ مکتب فکر کا نمائندہ شاعر ہے اور اپنے کلام میں اس نے
وہ ادبی روایات بحال رکھی ہیں جو روشانیہ مکتب فکر کے شعرا کی ہیں[1]۔ اس کے کلام کا نمونہ
ملاحظہ ہو۔

هورے لمر دے له نظریم تماشه کرم
دلے غوږ هورے کلام یم یا بدله
(ترجمہ: اُدھر دھوپ ہے میں نظر سے تماشہ کرتا ہوں۔ اِدھر کان اور اُدھر کلام ہے۔)

یاے   الف یکے نه اخلی درست نشان دے بے نشانه
(ترجمہ: الف پر نقطے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ پورا نشان ہے اور بے نشان ہے۔)

عارفان تے په پنهان اشارت مست کړه
او پلو دو را ندے وړ ی دائے دستور دے
اے واصله دګمان له اهله مه شه
دپیالے ګناه به و بخښی غفور دے
(ترجمہ: عارفوں کو پنہاں اشارے سے مست کیا۔ اس کا دستور یہ ہے کہ اپنا چہرہ نقاب سے
چھپائے رکھتا ہے۔ اے واصل! شک کا شکار مت ہو! وہ غفور ہے۔ پیالے کا گناہ
بخش دے گا۔)

واصل کے علاوہ روشانیہ مکتب فکر کی ادبی تحریک کے دوسرے شعراء کریم داد،
قادر داد روشانی اور اورکزئی وغیرہ تھے۔

روشانیہ مذہبی تحریک جو بعد میں ایک خالص ادبی تحریک کے رنگ میں نمودار ہوئی

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۱۲۷۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

اس میں ایک لمبے عرصے تک شعر و ادب کے ذریعے بایزید انصاری کے فلسفے کی تبلیغ کی گئی۔ اگرچہ وہ ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے تو کچھ عرصے کے بعد ختم ہوگئی لیکن ادبی تحریک کی صورت میں بیسویں صدی تک پہنچ آئی۔ واصل کے زمانے تک روشانیہ ادبی تحریک صرف تصوف کے ایک خاص مکتب فکر کی نمائندہ تھی۔ لیکن واصل کے بعد تصوف یہی مضمون پشتو شعرا نے الگ رنگ میں استعمال کیا۔ جس میں ملیّت کا رنگ بھی بھر دیا گیا۔

روشانیہ ادبی تحریک میں تین باتیں نمایاں ہیں۔ مذہب، زبان و ادب کا فروغ اور ملی احساس۔ بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک یہ تینوں رنگ اصل میں ایک ہی روشنی سے ہیں اور اس روشنی کا منبع اور مبدا، بایزید انصاری پیر روشان ہے۔ پیر روشان نے اپنے فرقے کی تربیت ایک خاص انداز سے کی ہے۔ پیر روشان کے مذہبی جذبات کا دھارا سیاست کی ندی میں بہنے لگا اور اپنے لیے ملّی احساس کی زمین پر رستہ بنایا۔ اسی لیے اس کی طریقت قومیت میں محدود ہوگئی اور اس کے خلفا نے مجبوراً سیاست کا رستہ اختیار کیا۔

ہمیں اس تحریک کے ادبی پہلو سے دلچسپی ہے جس نے پشتو زبان و ادب کو بہت کچھ بخشا۔ سب سے دلچسپ پہلو تو یہ ہے کہ روشانیہ تحریک کی رقابت میں اخون درویزہ بابا نے جو تحریک چلائی اس کا فائدہ بھی پشتو ادب ہی کو پہنچا۔

اخون درویزہ

اخون درویزہ بابا پشتو ادب کی تاریخ میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ اصل میں ترک نژاد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد افغان سے ننگرہار آئے تھے اور پشتونوں کے ساتھ رہائش اختیار کی تھی بعد میں ایک علمی گھرانے کی حیثیت سے یوسفزیوں کے ساتھ رہنے لگے اور اسی قبیلے میں بہت

عزت اور شہرت حاصل کی۔ اخون درویزہ کے والد کا نام شیخ گدائی تھا۔ اخون درویزہ نے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کے بعد سید علی ترمذی (حضرت پیر بابا) کی مریدی اختیار کی اور باقی ماندہ زندگی ان کے قدموں میں گذاری۔ پیر بابا نیبد یوسفزئی کے علاقے سدوم میں اپنے پیر کے حکم کے مطابق کوہستان کے لوگوں کی روحانی تربیت کر رہا تھا۔ جب بایزید انصاری (پیر روشان) ہشت نگر پہنچا اور پیر بابا نے محسوس کیا کہ اس کا مسلک پیر بابا سے مختلف ہے تو دونوں کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کے بعد نوبت جنگ تک پہنچی۔ اخون درویزہ نے پیر بابا کے مرید کی حیثیت سے اور بہت کچھ کرنے کے علاوہ بایزید انصاری (پیر روشان) اور اس کے ساتھیوں کی کردار کشی کی مہم پیر بابا کی وفات کے بعد بھی اپنی زندگی کے آخری دم تک جاری رکھی اور اس نے بایزید انصاری کی "خیر البیان" کے مقابلے میں پشتو میں "مخزن" لکھی۔ جس کے بارے میں اخون درویزہ فرماتا ہے کہ میں نے یہ کتاب "خیر البیان" کے رد میں لکھی ہے[ه]۔

"مخزن" کے متعلق میاں تقویم الحق کاکاخیل نے لکھا ہے کہ "مخزن الاسلام" ایک کتاب نہیں بہت سی کتب کا مجموعہ ہے۔ جس نے پشتونوں کو اسلامی علوم اور جید علماء سے آشنا کیا۔ اسی مقصد کے لیے اخون درویزہ بابا نے اپنے زمانے کی مختصر اور مشہور کتابیں کچھ تو مکمل طور پر اور کچھ کے ٹکڑے پشتو میں جمع کیے۔ ان میں مناسب اضافے کر کے "مخزن الاسلام" نام دیا۔ اس مجموعے میں چار مکمل کتابیں ہیں[ه]۔

پشتو ادب میں "مخزن" کا ایک خاص مقام ہے۔ اخون درویزہ کی ادبی تحریک میں اس کے بیٹے اور پوتے بھی شامل ہیں جنہوں نے "مخزن" میں اضافے کے علاوہ اپنی باقی تالیفات اور تصنیفات

[ه] مخزن (پشتو اکیڈمی) صفحہ ۲۰۱ (اخون درویزہ)

[ه] دیباچہ مخزن صفحہ ۱۰

کے ذریعے اخون درویزہ کی ادبی تحریک کو ترقی دی۔ اس تحریک کے باقی ساتھی اخون درویزہ کا صوفی بیٹا عبدالکریم جو کریم داد کے نام سے مشہور تھا اور اس کا پوتا عبدالحلیم ہے۔

اخون درویزہ نے نثر کے ساتھ ساتھ ایک مسلکی صوفی شاعر کی حیثیت سے پشتو زبان کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے "الف نامہ" اس کا ادبی کارنامہ ہے جس میں عوام کی اصلاح کے لیے دینی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

درویزہ پہ مشائخ کښې کمینہ دے

د کمینو څرنګ لویہ مرتبہ دہ

(ترجمہ: مشائخ میں درویزہ کمینہ ہے۔ کمینوں کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔)

پښتانہ شعرا میں عبدالحی حبیبی صاحب نے صفحہ ۱۳۶ پر لکھا ہے کہ اخون درویزہ نے اپنی کتاب "مخزن" نیم عروضی مسجع نثر میں لکھی ہے۔ اور پورے عروضی اشعار "مخزن" میں نہیں ہیں۔ مگر میر احمد شاہ رضوانی نے اپنی کتاب "بہارستان" میں اس کے وعظ و نصیحت کی مثنوی کے جو اشعار دیے ہیں ہم یہاں پر وہ نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ مختصر مثنوی اخون درویزہ کو پشتو عروضی شعرا کی قطار میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے[۱]۔ مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

راشہ واورہ زما ورورہ

فضیلت د صبر ګورہ

صبر ښہ دے پہ هر کار کښې

ولے زیات پہ دارو کار کښې

(ترجمہ: اے میرے بھائی آکر سن لو۔ صبر کی فضیلت دیکھو۔ صبر ہر کام میں اچھا ہے۔ لیکن سب سے

---

[۱] پی ایچ ڈی تھیسز غیر مطبوعہ ۱۵۰۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

زیادہ اسس روزگار میں ۔)

اخون درویزہ کے بعد اسس مکتب کا دوسرا بڑا شاعر عالم و فاضل کریمداد ہے جو اخون درویزہ کا بیٹا ہے[1] ۔ کریمداد نے مخزن کی تدوین کی صورت میں اور الف نامے میں اضافے کے لحاظ سے پشتو ادب کی خدمت کی ہے ۔ اس کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں ہے مگر حبیبی صاحب کے خیال میں وہ سنہ ۱۰۰۰ہجری کے بعد پیدا ہوا ہے ۔ کہتے ہیں کہ مفتی غلام سرور لاہوری "خزینۃ الاصفیا" میں اور رحمان علی "تذکرہ علمائے ہند" میں اس کا تذکرہ کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ کریمداد سنہ ۱۰۷۳ہجری میں فوت ہوا ۔ اس وجہ سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ سنہ ۱۰۰۰ہجری کے بعد پیدا ہوا تھا۔[2]

عبدالکریم یا کریمداد ایک بڑا عالم اور اچھا شاعر تھا ۔ اسس کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کا قائل ہے ۔ اس کے کلام میں بہت سے شعری محاسن ہیں ۔ اس نے عشقیہ شاعری کے علاوہ اس کے ساتھ الف نامہ بھی ملایا ہے اور کسی حد تک شرح بھی کی ہے ۔ اس کا انداز اپنے باپ کے مکتب فکر کا نمائندہ ہے ۔ کلام ملاحظہ ہو ۔

کریمداد چہ څہ وئیلی ،

د خپل پلار رحم پہ دہ دے

(ترجمہ : کریمداد جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر اسس کے باپ کا رحم ہے ۔)

اور اسی سلسلے میں پیر بابا کا بھی مقلد ہے ۔

دا گفتار د غواصانو شیخ علی

غوندے غواص د تا باشدہ دی

---

[1] پښتانہ شعرا، صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷ (حبیبی)

[2] پښتانہ شعرا، صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸ (حبیبی)

دے غواص صاحب دور دے

سر بازل هنر د دهٔ دی

(ترجمہ: یہ گفتار غواصوں کے شیخ علی جیسے غواص تجھے ہی زیب دیتا ہے۔ یہ بھی اسی در کا غواص ہے۔ سر کی بازی لگانا اس کا ہنر ہے۔)

اسی مکتب فکر کا دوسرا شاعر عبدالحلیم ہے۔ عبدالحلیم کے بارے میں آقائے حبیبی نے لکھا ہے "عبدالحلیم عبداللہ کا بیٹا اور اخون درویزہ کا پوتا تھا۔ جو ۱۰۰۰ھ ہجری کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر اپنے دادا کے سبک اور گروہ میں داخل تھا لیکن اس کے کچھ اشعار عروضی بھی ہیں جن کی بنا پر ہم اُسے پشتو کے شعرا میں شمار کرتے ہیں[1]۔

روشانیہ اور درویزہ مسلک کے علاوہ اس زمانے میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے تھے جن کا تعلق کسی خاص مکتب فکر سے نہیں تھا مگر اس زمانے میں پشتو شاعری کی فکر کے تجربے کیے ہیں۔ ان میں سے ایک مُلا الف ہوتک ہے اور دوسرے شاعر کا نام امیر ہے جس نے ۱۰۳۳ھ ہجری میں پشتو کی چھوٹی بحر کی مثنوی میں قرآن پاک کی تجوید لکھی ہے[2]۔

اس کے علاوہ دوسرا قابل ذکر شاعر ملامست[3] ہے۔ کہتے ہیں کہ مُلامست بہت عالم فاضل آدمی تھا۔ اخون چالاک خٹک کا مرید تھا۔ سلوک اور معرفت کا رستہ بھی اپنایا تھا۔ وہ مست بابا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی قبر شنواریوں کے علاقے میں ہے۔ ملامست کے صوفیانہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

---

[1] پښتانه شعراء جلد ۱ صفحہ ۱۳۹ (آقائے حبیبی)

[2] دپښتو دادب تاریخ صفحہ ۳۹ (رشتین)

[3] دپښتو دادب تاریخ صفحہ ۴۰ (رشتین)

د یقین زغره مے واغوسته سپاهی شوم
د باور په تیغ مے غوخ کړه گما نونه
د معرفت لینده په لاس له بدو جنگ کړم
د حقیقت غشی مے ځی تر آسمانو نه

(ترجمہ: میں نے یقین کی زرہ بکتر پہنی، سپاہی بنا۔ میں نے شک کے تار بھروسے کی تلوار سے کاٹ ڈالے۔ معرفت کی تلوار میرے ہاتھ میں ہے، برائی کے ساتھ نبرد آزما ہوں۔ میرے حقیقت کے تیر آسمان تک پہنچتے ہیں۔)

بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک یہ ساری ادبی تحریکات روشانیہ تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوئیں جس نے بعد میں خالص ادبی تحریک کی حیثیت سے پشتو کے آئندہ ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

مولانا عبدالقدوس قاسمی نے "خیرالبیان" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ روشانیہ تحریک کی وجہ سے پشتو ادب کے سرمائے میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ اور احساس پشتو ادب کے طلبا کو دن بدن تیزی سے ہو رہا ہے۔

پشتو شاعری کا تیسرا زریں دَور
خوشحال خان خٹک اور ان کے پیروکار

پشتو ادب اور پشتو شاعری کا سنہرا دور خوشحال خان خٹک، اس کی اولاد اور اس کے ہم عصروں سے شروع ہوتا ہے جس میں نہ صرف پشتو ادب اور شاعری تکمیل تک پہنچی بلکہ پشتون ثقافت کے خدوخال کی تصویر کی ہمہ گیر نمودار ہوئی اور تہذیب کا مکمل چہرہ نظر آیا۔[1]

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۱۶۲۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

خوشحال خان خٹک سے پہلے روشانیہ ادبی تحریک اور اس کے ساتھ علما کے ادب نے حتی المقدور پشتو زبان کی خدمت کی تھی۔ روشانیہ تحریک والوں کے سامنے اگرچہ پشتو کو علمی بنانے کا مقصد تھا مگر یہ مقصد ان کے فلسفے کی اشاعت کے مقصد سے منسلک تھا۔ جونہی ان کے مرکزی مقاصد سیاست کی تاریکیوں میں گم ہوئے تو اس کا اثر لامحالہ طور پر زبان و ادب پر بھی پڑا۔

روشانیوں کے آخری آثار رشید آباد میں محصور ہوئے۔ وہ فتووں سے یا تو دریا برد کیے گئے اور یا جلائے گئے۔ پشتو میں جو کچھ باقی رہا وہ بعض دینی مسائل تھے۔

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے اپنے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے میں لکھا ہے کہ اس کے علاوہ مغلوں کی حکومت کے دوران فارسی درباری زبان بھی تھی اور علمی بھی۔ لہٰذا پشتون علما دربار تک رسائی حاصل کرنے کے شوق میں فارسی سیکھنے اور لکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ دن پشتونوں کے مکمل انتشار کے تھے۔ ایک طرف ان کی ثقافت مغلی اور فارسی یلغاروں کی نذر ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان کی غربت کے سبب جہالت کا وہ دورہ تھا جس میں مقامی اور ثقافتی کردار تباہ ہو جاتا ہے۔

قدرت کو چونکہ ان کی ثقافت اور زبان کی بقا منظور تھی تو ایسے حالات میں خوشحال خان خٹک کو پیدا کیا جو اپنی ذات میں مکمل ثقافت کا علمبردار تھا۔

خوشحال خان خٹک مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانے میں ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ ہجری (مئی، جون ۱۶۱۳ء عیسوی) کو نوشہرہ کے اکوڑہ خٹک نامی گاؤں میں پیدا ہوا جس کا باپ شہباز خان، دادا یحیٰی خان اور پردادا ملک اکوڑ خان تھا۔ وہ خانی اور سرداری کے گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور یہ خانی اور نوابی اس کے پردادا اکوڑ خان کو مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں ملی تھی۔

بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اگرچہ یہ گھرانہ مغل حکومت کا منصبدار تھا مگر اس خاندان پر کبھی بھی درباریت اثرانداز نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا پشتون تشخص اور اپنی پشتون روایات

کو بحال رکھا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ شہباز خان کے سرداری کے زمانے میں خوشحال خان کی تربیت
خالص پشتون ماحول میں ہوئی ۔ تعلیم و تربیت اور مروجہ تعلیم کے حصول کے مواقع اسے حاصل تھے
اس کی بصیرت اور علمیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی میدان میں اس نے کوئی کمی باقی نہیں
چھوڑی تھی ۔ مروجہ علوم کے علاوہ بھی اس نے بہت کچھ پڑھا ہے لیکن پھر بھی وہ اس حسرت کا
اظہار کرتا ہے کہ شکار اور باقی مشاغل نے مجھے علم سے دور رکھا ۔ اس بارے اس کے اشعار
ملاحظہ ہوں ۔

طبیعت مے عطائی نہ د تحصیل دے
کہ خبریم د املاء پہ استعمال
یو ساعت بہ م پہ درس شل مے پہ ښکار وو
کلہ ښکار پرېښوم پہ کسب د کمال
د جہان تحصیل بہ کُل واړه زما وو
کہ اختہ نہ وے د ښکار پہ اشتغال

(ترجمہ : میری طبیعت تحصیل کی نہیں عطائی ہے ۔ گو میں املا کے استعمال سے واقف ہوں ۔ میں ایک
گھنٹہ درس میں اور بیس گھنٹے شکار میں رہتا تھا ۔ شکار نے مجھے کسب کمال کا موقع ہی نہیں دیا
اگر میں شکار کے شغل سے فارغ ہوتا تو سارے جہان کا علم حاصل کر لیتا ۔)

ان اشعار میں تحصیل کے متعلق حسرت سے خوشحال خان خٹک کی علم کے ساتھ وابستگی
کا پتہ چلتا ہے ۔ ورنہ اس کی علمیت ہر لحاظ سے مکمل تھی ۔ مگر چونکہ جینئس ہے بیک وقت عالم،
حکیم، جرنیل، فلسفی، طبیب، شاعر، ادیب اور سب کچھ ہے ۔ یہاں تک کہ نجوم اور فلکیات کے علم
میں بھی دسترس رکھتا ہے ۔ خوشحال خان خٹک کے کلیات میں زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں

جس پر اس نے بحث نہ کی ہو۔[1]

آغائے حبیبی نے اس بارے میں لکھا ہے "خوشحال خان نے بچپن میں اپنے زمانے کے تمام مروجہ علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اسلامی علوم جیسے فقہ، حدیث، تفسیر اور باقی عقلی اور فلسفی علوم جیسے منطق، حکمت اور ادبی علوم اور فصاحت و بلاغت کے اصول جیسے معانی، بیان، عروض، قافیہ اور باقی سب پڑھے تھے اور ان کا عالم تھا۔"[2]

خوشحال خان کے ایک بڑے عالم اور جینیس ہونے کی حیثیت ہر دور میں ہر کسی نے تسلیم کی ہے۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنے بے مثال کردار کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں منفرد حیثیت اور خصوصیت کا حامل ہے۔ اس کی زندگی مبارزت، جنگ، حوادث اور واقعات کا مرقع ہے۔ خوشحال خان کی جامع شخصیت کے ہر پہلو پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہمارا مقصد اس کی زندگی کے باقی واقعات کی تاریخ نہیں۔ ہمارے سامنے خوشحال خان خٹک کا وہ پہلو ہے جس کی بنا پر اسے پشتو کا باپ کہا جاتا ہے[3]۔ ساتھ ہی خوشحال خان خٹک کی اس ادبی تحریک کی نشان دہی کرنی ہے۔ جس کی بنا پر پشتو ادب ایک ایسے کمال تک پہنچا کہ آج تک آنے والی ادبی تحریکوں کے لیے ایسا رستہ پیدا کیا کہ خوشحال خان کے زریں دور کی تحریک کی تشریح پیش کریں اور ان منازل تک پہنچیں جن کی نشاندہی خوشحال خان نے کی ہے۔ پشتو ادب کا یہ سنہرا دور جو خوشحال خان کی ادبی تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اپنے پس منظر میں بہت کچھ کا حامل ہے[4]۔

---

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۱۹۶۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

[2] د خوشحال منتخبات صفحہ ۱۰ (مقدمہ آغائے حبیبی)

[3] خوشحال پشتو شعر کا باپ اور پہلا استاد سمجھا جاتا ہے۔ مقدمہ د خوشحال منتخبات صفحہ ۸۰۔ آغائے حبیبی۔

[4] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ ۱۹۷۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

خوشحال خان سے پہلے پشتونوں کی تہذیب کا ایک دور ختم ہوا تھا۔ دوسرا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس عبوری دور میں پشتونوں کو ایک مکمل انتشار کی صورت حال کا سامنا تھا۔ مغلوں کی منصب داری سے لے کر پشتون ثقافت کی علم برداری تک خوشحال کا آنا لمبی بحث کا متقاضی ہے۔ جس کا یہ موقع نہیں مگر اس کے ادب میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ ایک ایسی ادبی تحریک ہے جو اپنے دامن میں پشتون ثقافت کے لیے بہت کچھ سموئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلی ضرورت خوشحال خان کے سامنے پشتونوں کو تعلیم دینا تھی۔ یہ تعلیم اپنے تشخص کی پہچان، اتفاق اور اپنی زبان سے محبت کی تھی۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

پریوه ژبه ویل سره پښتو کړو
ولې نه شو دیوبل نه خبردار

(ترجمہ: ہم ایک ہی پشتو زبان میں بات کرتے ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔)

خوشحال خان خٹک کے زمانے میں معیاری ادب عربی اور فارسی کا تھا۔ فارسی کو درباری سرپرستی حاصل تھی۔ جس کی بنا پر پشتو کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ اسی وجہ سے خوشحال خان کو احساس ہوا کہ ممکن ہے اس صورت حال کے سامنے پشتو زبان کا وجود بھی باقی نہ رہے لہذا اس نے اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

که تازي ژبه مه گوره ښه ده
فارسي هم ډیره په خوند خوږه ده
چا ئے پلو دجال وا نه خست
پښتو لا هسې بکره پرته ده[1]

---

[1] کلیات خوشحال صفحہ ۳۰، ترتیب دوست محمد خان کامل

(عربی زبان اگرچہ بہت اچھی ہے ۔ فارسی بھی بہت شیریں زبان ہے ۔ مگر پشتو ابھی تک باکرہ ہے ۔ ن
نے بھی اس کے جمال کا پلو نہیں اٹھایا ۔)

خوشحال خاں کے سامنے صرف یہ مقصد نہیں تھا کہ پشتو زبان کی طرف توجہ دی جائے بلکہ یہ بھی
تھا کہ پشتو کو جلد از جلد ان زبانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا جائے ۔ اس کا شعر ملاحظہ ہو ۔

پہ وزن پہ مضمون پہ نزاکت او پہ تشبیہ کښې
پښتو ولې عین تر فارسی دی رسولی

(ترجمہ : وزن مضمون ، نزاکت اور تشبیہ کے لحاظ سے میں نے پشتو کلام کو فارسی کے ہم پلہ بنایا ہے)

لہٰذا اس نے اپنی مثالی علمیت اور قابلیت کی بنا پر نامساعد حالات اور عدیم الفرصتی کے باوجود
اتنی زیادہ کامیاب تصنیفات کیں کہ پشتو یک دم سے بام تکمیل تک پہنچی ۔

خوشحال خان نے شعوری طور پر ایک نئی ادبی تحریک شروع کی اور تمام مضامین پشتو میں
لکھے جو اس زمانے کے معیاری زبانوں کے ادب میں تھے ۔ اس نے نیا رسم الخط جاری کیا ۔
نثر کو نیا اسلوب دیا اور شعر میں اتنا کچھ کہا کہ فارسی اور عربی سے بھی زیادہ مضامین اس میں سمو دیے ۔ لہٰذا
اسے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ۔

کہ د نظم کہ د نثر کہ د خط دے
پہ پښتو ژبہ مے حق دے بے حسابہ
نہ پخوا پکښې کتاب وو نہ ئے خط وو
دا خو ما پکښې تصنیف کړل څو کتابہ

(ترجمہ : چاہے نظم ہے ، نثر ہے یا خط ہے ، پشتو زبان پر میرا بہت زیادہ حق ہے ۔ نہ تو پہلے اس میں
کتاب تھی اور نہ رسم الخط ۔ میں نے ہی اس میں چند کتابوں کو تصنیف کیا ۔)

پشتو کے ایک خاص رسم الخط کے متعلق مختلف محققین نے الگ الگ رائے دی ہے۔ دوست محمد خان کامل صاحب "کلیات خوشحال خان خٹک" کے مقدمے میں لکھتا ہے کہ "زنجیری مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کا ایک طریقہ تھا جو خان نے ایجاد کیا تھا" ۔ حبیبی صاحب نے خوشحال ملغلرے کے مقدمے میں جناب زمریالی کے مضمون کے حوالے سے لکھا ہے "اسی طرح مستشرق راورٹی انگریز نے لکھا ہے کہ خوشحال خان نے ایک قسم کی مختصر نویسی اور رمز نویسی کو ایجاد کیا تھا جو صرف اس کے خاندان تک محدود تھا۔ دوسرے لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے اور اس کا نام زنجیری تھا۔

خط کے سلسلے میں جو اجتہاد یا تجدید خوشحال خان خٹک نے کیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ پشتو کی ایک الگ انفرادیت ہو۔ ورنہ عربی یا فارسی رسم الخط سے بھی کام چل سکتا تھا۔ اپنی کتاب "دستارنامہ" میں خوشحال خان نے فنون کے باب میں جو ذکر کیا ہے اس میں تیسرا ہنر یا فن خط کا ہے۔ خان، سردار یا بادشاہ کے لیے اس کا کسب کمال حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

خوشحال خان خٹک نے باز، شیر اور ننگیال کی علامات میں جس مثالی پشتون کردار کا ذکر کیا ہے یہ پشتون اس کے خیال میں خونخوار نہیں ہے بلکہ شر اور فساد کے دفع کے لیے معاشرے کا آئیڈیل پیش کیا ہے جو اس کے خیال میں نیک ہے۔ غافل کمزوری اور شر کی علامت ہے اور معاشرے سے اس شر کو دور کرنے کے لیے مسکین کے لیے تلوار کے استعمال کا حق حاصل ہے۔

خوشحال خان خٹک نے ننگیال کی صورت میں جس کردار کو آگے کیا ہے غیرت و حمیت کی بنا پر اُسے خوشحال خان نے یہ حق دیا ہے کہ وہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا مظاہرہ نہ کرے۔ کیونکہ اس کے خیال میں بے غیرتی، کمزوری اور برائی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ننګیال د ننګ د پاره
په هر څه لګوی اور

(ترجمہ: غیرت مند عزت کے تحفظ کے لیے سب کچھ نذرِ آتش کر دیتا ہے۔)

خوشحال خان خٹک کا ننگیال (صاحبِ غیرت و حمیت) ایک خالص اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے طاقت کے استعمال کی خاطر شرعی طریقہ جائز رکھتا ہے۔

پہ اولیو چہ روانہ دی شوندے مہ بزدہ
پہ ورځ زرځو نومنہ کړہ پہ شریعت

(ترجمہ: دن میں شریعت کے مطابق ہزار قتل کرو لیکن وہ پانی ہونٹ سے مت لگاؤ جو از روئے شرع روا نہ ہو۔)

بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اگر خوشحال خان خٹک کے اشعار کا مجموعی تاثر لیا جائے تو وہ خالص رومانی ہے۔ وہ نیکی اور حسن کو دل کی دلیل سے مانتا ہے عقل کی دلیل سے نہیں۔ خوشحال خٹک کے رومانی مزاج کا گواہ اس کا دیوان ہے۔ اپنے قصائد میں وہ حسن تلوار وں کی جھنکار میں دیکھتا ہے۔

بیا لہ کومہ راپیدا شو دا بہار
چہ پہ ھر لوری ئے ملک کړو لیو گلزار
د سپرلی گلونہ ویر پہ ھر ھر رنگ شتہ
وے سرۂ لالہ دی لا پہ کښے او نخار
ساقی راشہ ڈکے ڈکے پیالے راکړہ
چہ د مَیو پہ مستئ کښے شم سرشار
پښتنو زلمیو بیالا مُونہ سرۂ کړل
لکہ باز منګلے سرے کا پہ ښکار

(ترجمہ: پھر یہ بہار کہاں سے آئی جس نے ہر طرف سے ملک کو گلزار بنایا۔ بہار میں اگرچہ ہر طرف کو رنگ برنگ کے پھول ہیں لیکن سرخ لالہ کی حیثیت امتیازی ہے۔ ساقی! آجا مجھے بھرے ہوئے جام پلا۔ تاکہ میں مے کی مستی میں سرشار ہو جاؤں۔ پشتون جوانوں نے اپنے ہاتھ پھر خون سے رنگ لیے جیسے باز اپنے پنجے شکار سے سرخ کر لیتا ہے۔ انہوں نے اپنی سفید تلواریں خون سے گلگوں کیں۔ اساڑھ کے مہینے میں لالہ زار شگفتہ ہوا۔)

خوشحال خان خٹک نے پہلی دفعہ پشتو شاعری میں تقریباً ان تمام اصناف سخن کو متعارف کرایا جو فارسی اور عربی شاعری میں موجود تھے۔ اس نے غزل، رباعی، قصیدہ، مخمس مسدس، معشر، ترکیب بند وغیرہ سب پر طبع آزمائی کی۔ اس نے فارسی اور عربی کے فنی صنعات کو بھی پشتو میں اپنایا۔ جیسے تجنیس، حسن تعلیل، طباق الاضداد، ابہام، صنعت ترجیع، تنسیخ الصفات، لف و نشر وغیرہ۔

لیکن اس نے اس بات کا اپنی شاعری میں خاص طور سے خیال رکھا کہ پشتو شاعری میں فارسی شاعری کی طرح فراریت (ESCAPISM) شامل نہ ہو۔ وہ زندگی میں فرار کی بجائے عمل کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

اس نے شاعری میں رومانیت کے علاوہ بھی ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور اس کا حق بھی ادا کیا ہے۔ خوشحال کے اکثر اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یونانی فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ پھر بھی ہمیشہ اپنے کلام میں راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔

فلسفه، معتزله واړه ګمراه دي
چه بې شرعې په خپل رائے کاندي ترغیب

(ترجمہ: فیلسوف اور معتزلہ سب گمراہ ہیں جو شریعت کی بجائے اپنی رائے کو مقدم رکھتے ہیں۔)

ما قرآن منلے چه نازل دے له آسمانه
نور و ته بخښلے چه خبرے یونانی دي

(ترجمہ: یونانی فلسفے دوسروں کو مبارک ہوں، میں تو آسمانی کتاب قرآن پر عقیدہ رکھتا ہوں۔)

شجاعت کے بارے میں اس کا حتمی فیصلہ یہ تھا۔

که آسمان دے د زمري په خله کښے ورکا
د زمري په خله کښے مه پریږده همت

(ترجمہ: اگر آسمان تجھے شیر کے منہ میں بھی دے ڈالے تو شیر کے منہ کے اندر بھی ہمت سے کام لیتے رہو۔)

اس کی خودی کا یہ حال ہے

که مې حلق له تندے وچ شي په همت کښے
پروا دار کله په حوض د کوثر یم

(ترجمہ: ہمت کرتے ہوئے اگر میرا حلق پیاس سے خشک ہو جائے۔ پھر بھی میں حوض کوثر کو خاطر میں نہیں لاتا)

د منت دارو که مرم پکار مې نه دي
که علاج لره مې راشي مسیحا هم
د فرښتو آمین منت دے په دُعا کښے
لا حرم ور رخصې پته کړم دُعا هم

(ترجمہ: اگر خود مسیحا بھی میرے علاج کے لیے چلا آئے تو مرتے ہوئے بھی میں وہ دوا نہیں کھاؤں گا جس میں کسی کا احسان اٹھانا پڑے۔ دُعا میں فرشتوں کا آمین کہنا احسان کے مترادف ہے، اس لیے میں ان سے چھپا کر دُعا کرتا ہوں۔)

آزادی اور اختیار کے متعلق اس کی رائے یہ ہے۔ ؎

چہ د بل تر لاسو ورشی د بل شو
مرد پہ خپل لری د خپل فکر زمام

(ترجمہ: جب دوسرے کے ہاتھ آئے پھر تو دوسرے کا ہو گیا۔ مرد تو وہ ہے جو زمامِ فکر اپنے ہاتھ میں رکھے۔)

و بلا تہ د اختیار تورہ پہ لاس کرم
و قضا و تہ تسلیم پہ شان د مړی یم

(ترجمہ: اختیار کی تلوار ہاتھ میں لیے ہر مصیبت کے مقابلے کے لیے تیار ہوں لیکن قضا کے سامنے سرِ تسلیم ایسا خم ہے جیسے لاش۔)

فعلیت یا توانیت کی تعریف یوں کرتا ہے

دمز ریو مرتنوب پہ لښکر نہ دی
مہ نہ هر کلہ یواځې پہ خپل ځان ښی

(ترجمہ: شیر اس لیے بہادر نہیں ہوتے کہ ان کے پاس لشکر ہوتا ہے وہ تن تنہا بہادری کیا کرتے ہیں۔) لذتی جمالیات کے متعلق کہتا ہے۔

چہ آیینہ تہ ښکارہ دیدار کړے
آیئنہ درستہ سرہ گلزار کړے

چہ شو نندے کیبز دے دجام پہ مونگو
او بۂ پہ جام کینے رُب انار کرے

(ترجمہ : جب تو آئینے کو دیدار بخشتا ہے تو تمام آئینہ گلزار بن جاتا ہے۔ جب تیرے ہونٹ جام پر لگ جاتے ہیں تو جام کے اندر پانی رُبِ انار بن جاتا ہے۔)

خوشحال خان نے پشتو میں اتنے زیادہ مضامین متعارف کرائے اور زبان کی پابندیاں اس حد تک توڑ ڈالیں کہ جہاں بھی اظہار میں مشکل پیش آئی وہاں پشتو میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی الفاظ کا استعمال کرکے پشتو کا دامن پھیلایا لیکن اس نے بنیادی طور پر دیدہ و دانستہ پشتو زبان کو اپنایا ہے۔ ورنہ جیسے کہ اس نے خود کہا ہے وہ اس زمانے کے دوسرے لوگوں کی طرح فارسی میں بھی ہر پہلو پر اظہار خیال کرسکتا تھا۔

فارسی شعرے هم زده سلیقه لرم د دواړو
پښتو شعرے خو بس کړ و هر څوک خپل لری بناغلی

(ترجمہ : میں فارسی میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں۔ مجھے دونوں کا سلیقہ حاصل ہے لیکن میں نے پشتو شعر اس لیے اپنایا کہ ہر کسی کو اپنے عزیز ہوتے ہیں۔)

اسی زمین پر اشرف خان ہجری کا شعر ملاحظہ ہو ۔

دُرفروشو کره کور په کور ژړا شي
چه گویا تیکه خندانه د زبان کا

(ترجمہ : جب وہ ہنستا ہے تو در فروشوں کے گھر گھر صف ماتم بچھ جاتی ہے۔)

اپنے ہجر کے متعلق لکھتا ہے۔

---

(1) Selections from the Poetry of the Afghans, (By Maj. Raverty).

زهٔ خټک هرگز رضا په پردیس نهٔ یم
دیار مینې کړم جُدا له قرابات

(ترجمہ: میں خٹک پردیس پر ہرگز راضی نہیں ہوں۔ یار کی محبت نے مجھے قرابات سے جدا کیا۔)

اس نے اکثر شاعرانہ تعلی سے بھی کام لیا ہے۔

په پښتو ژبه مې سیال دشعر نشته
دمعنو په جهان شاه اشرف خټک یم

(ترجمہ: پشتو زبان میں میرے شعر کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، میں اشرف خٹک دنیائے معانی کا بادشاہ ہوں۔)

اسی مکتب فکر کا دوسرا وارث خوشحال خان خٹک کا بیٹا عبد القادر خان خٹک ہے۔ اگرچہ خوشحال خان کی اولاد میں عمر کے لحاظ سے دسویں نمبر پر ہے لیکن ادبی لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ اس لیے کہ خوشحال خان نے اپنے بیٹوں کی ادبی تربیت خود کی ہے۔ اسی لیے اس کے بیٹے اس کے براہ راست شاگرد بھی ہیں۔ اسی شاگردی کا ذکر کرتے ہوئے اشرف خان ہجری نے ایک موقعے پر کہا ہے۔

اوس چه وایه حقیقت د شاگردانو
چه هر یو له دے هنره بهره ور دے
قادر خان که بحر بولم دروغ نهٔ دی
چه ئے فکر د اصل دُرو مصدر دے

(ترجمہ: اب اس کے شاگردوں کی حقیقت بیان کی جاتی ہے جن میں سے ہر ایک نے اس ہنر سے بہتر پایا ہے۔ اگر قادر خان کو بحر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کیوں کہ اس کی فکر اصلی

دُر کا مصدر ہے ۔)

عبدالقادر خان ۲۵ ذی الحج ۱۰۶۳ھ ہجری کو پیدا ہوا تھا ۔ کتاب پٹہ خزانہ میں اس کی ولادت کی تاریخ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۶۱ھ ہجری لکھی گئی ہے جو تاریخ مرصع کے واضح مادۂ تاریخ کے مقابلے میں سراسر غلط ہے ۔

عبدالقادر خان ایک عالم اور قادر الکلام شاعر تھا جس نے غزل، نظم، مخمس، رباعی قطعات وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے ۔ کلام ملاحظہ ہو ۔ ؎

غزل پہ پښتو ژبه چه بیان عبدالقادر کړ ،
د روغون یم که بے خانه وائی بل یو پښتون ھے

(ترجمہ : یہ غزل جو عبدالقادر نے پشتو میں بیان کی ، اگر خان (خوشحال خان) کے علاوہ کوئی اور پشتون ایسا کہہ سکے تو میں جھوٹا ہوں گا ۔)

اسی مکتب کا تیسرا پیرو کار خوشحال کا بیٹا صدر خان خٹک ہے جو اپنے باپ کے ساتھ بے پناہ محبت رکھتا تھا ۔ وہ قلم اور تلوار دونوں سے اپنے والد کی تحریک کا پیرو کار تھا ۔ شعر و ادب میں اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

دعشق یو سبق کافی دے
تور د کل جهان دفتر هیڅ

(ترجمہ : عشق کا ایک ہی سبق کافی ہے اس کے مقابلے میں سارے جہان کا دفتر بے معنی ہے ۔)

صدر خان خٹک نے اپنے باپ کے کہنے پر آدم درخانی کی منظوم مثنوی بھی لکھی ہے ۔ اس سلسلے میں خوشحال خان خٹک کے بیٹے سکندر خان خٹک کا چوتھا نمبر ہے ۔ سکندر خان

کا ذکر افضل خان نے تاریخ مرصع میں کیا ہے لیکن اس کی پیدائش کی تاریخ نہیں لکھی ۔ وہ ایک رنگین بیان اور حساس شاعر تھا ۔ اس نے غزل ، رباعی ، قصیدہ ، حمد و نعت اور قطعات میں طبع آزمائی کی ہے ۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ۔ ؎

د چمبې د گلو هار که هر څو سپین دے
ستا په سپینه سینه بالیده شی هار تور
په خبر خیر نه هسے مخ گوره سکندره!
چه د ے کسی شی خالونه په رخسار ستور

(ترجمہ : ہر چند کہ چمبیلی کے پھولوں کا ہار سفید ہے لیکن تیرے سفید سینے کے اوپر وہ کالا نظر آرہا ہے ۔ اے سکندر ! اس کے چہرے کو اس وقت تک کر دیکھو کہ تیری آنکھ کی پتلیاں اس کے رخسار پر کالے خال بن کر رہ جائیں ۔)

بیٹوں کے علاوہ خوشحال خان کی بیٹیوں میں بھی شعر و ادب کا ذوق تھا ۔ اسی سلسلے میں اس کی بیٹی حلیمہ خٹک کا نام مشہور ہے ۔

خوشحال خان خٹک کے چھوٹے بھائی فقیر جمیل بیگ نے خوشحال خان کی زندگی میں فقر و درویشی کا رستہ اختیار کیا تھا اور حضرت شیخ رحمکار کا کا صاحب ؒ کا مرید تھا ۔ اس نے فارسی میں دو مشہور کتابیں "تذکرۃ الاولیا" اور "نور محمدیہ" لکھی ہیں ۔ پشتو میں اس کے ہم تک صرف ٹپے پہنچے ہیں ۔ جو شمس الدین کا کاخیل نے مناقب فقیر میں محفوظ کیے ہیں ۔ حضرت کاکا صاحب ؒ کی تجہیز و تکفین کے موقع پر اس کا ایک مشہور ٹپہ مندرجہ ذیل ہے ۔

په بوئ مصقول عالم خوشبوئ شو
اصیل چند نره په تا پر بوتل گردونه !

(ترجمہ: تیری خوشبو تمام عالم میں پھیلی۔ اے اصیل چندن! آج تو زیرِ خاک ہوا۔)
خوشحال خان کی بیٹی بی بی حلیمہ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

آشنائی پہ فکر خو بنہ ھسے شان شوم
نہ پوھیزم چہ ممتاز کہ نورجہان شوم
چہ ئے کرمہ ستا پہ مینہ سرفرازہ
ثنا خوانہ پہ ځو رنگہ د رحمٰن شوم

(ترجمہ: آشنائی کی فکر سے یوں مسرور ہوئی کہ مجھے اپنا آپ ممتاز محل اور نورجہاں دکھائی دیتا ہے۔ جس نے مجھے تیری محبت سے سرفراز کیا اس لیے میں رحمٰن کی کئی طرح سے ثنا خوان ہوئی۔)

خوشحال خان خٹک کی اولاد میں شعروادب کے لیے اس کے بیٹے گوہر خان خٹک اور آزاد خان کے نام بھی آتے ہیں لیکن ان سے پہلا نمبر اس کے پوتے اور جانشین افضل خان خٹک کا ہے جس نے ایک مضبوط ارادے اور شعور کے ساتھ خوشحال کے ادبی ورثے کی حفاظت کی۔ "تاریخ مرصع" اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے اپنے دادا کے بیاض کو جمع کیا۔ دیوان کو مرتب کیا اور اس کی باقی کتابوں "دستارنامہ"، "فراق نامہ" اور "فضل نامہ" وغیرہ کی کتابت کرائی۔
اس کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

صورت مے ھر څو کہ ډیر ز لبون دے
کہ مے دمزکے دلاندے یون دے
زۂ بہ پہ لوری داشنا خوزم
کہ یون مے ھر څو پہ شوا خون دے

(ترجمہ: میری صورت ہر چند کہ کمزور ہے اور بہت مشکل سے قدم اٹھا سکتا ہوں۔ باوجود تمام

مشکلات کے بھی محبوب کی طرف میری رفتار جاری رہے گی۔)

پشتو غزل کا دور

رحمٰن بابا اور ان کے پیروکار

خوشحال کے دور میں پشتو ادب کی جو فنی تکمیل ہوئی اس میں فن اور صورت کے لحاظ سے پشتو غزل باقی اصناف کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئی۔ اگرچہ اس کی شاعری کی روح قصائد میں ہے مگر پشتو غزل کو فنی لحاظ سے خوشحال نے جلا بخشی۔ لہٰذا اس کے ادبی مکتب کے ورثا نے زیادہ توجہ پشتو غزل کو دی۔ اس کی اولاد کے علاوہ جس شاعر نے پشتو شاعری اور پشتو غزل میں ایک نیا جہاں آباد کیا اور تمام پشتو بولنے والوں میں اُسے جس قسم کی مقبولیت حاصل ہوئی، ہر گھر، ہر جھونپڑے، ہر مکتب، ہر مسجد، ہر کھیت اور کھلیان، ہر چوٹی اور دامن، ہر جنگل اور صحرا میں جس طرح اس کے کلام کے نغمے گونجنے لگے اس کی روشنی میں بجا طور پر اس کے اس شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔

هم نغمې کاندي هم رقص کا هم خاندي
د رحمٰن په شعر تُرے دبا گرام

(ترجمہ: باگرام کی حسینائیں جب رحمٰن کا شعر سنتی ہیں تو ہنس کر رقص شروع کرتی ہیں اور نغمے گاتی ہیں۔)

میری مراد حضرت عبدالرحمٰن بابا سے ہے جسے ایک فرد، ایک خاندان اور ایک قبیلے نے نہیں، سارے پشتونوں نے بابا تسلیم کیا ہے۔ بابا پشتو میں باپ کو کہتے ہیں اور پشتون سوائے اپنے باپ کے، سوائے سادات کے یا تسلیم شدہ دینی بزرگوں کے کسی کو باپ تسلیم

کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور خصوصی طور پر کوئی پشتون دوسرے پشتون کو باپ تسلیم نہیں کرتا۔ صرف ایک استثنیٰ عبدالرحمن بابا کو اس سلسلے میں حاصل ہے۔ اس کا نام اور کلام پشتونوں کے روح و دل میں یوں رچ بس گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں آج تک کوئی دوسرا نام پیش نہیں کیا جاسکا اور یہی کلام اس کے ساتھ گہری عقیدت کا باعث بنا ہے۔ اُسے خود بھی اس بات کا احساس ہے ے

چہ کشور دافغانانو معطر شی

دھر بیت مصرعے مے زلفے دخوبان کڑے

(ترجمہ: میرے ہر بیت کے مصرعوں کو زلفِ خوبان بنا تاکہ اس سے افغانوں کا کشور معطر ہو جائے۔)

وہ یقیناً ایک معجز بیان شاعر تھا جس نے عشق، تصوف اور اخلاقیات کو اپنی شاعری میں کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کا شعر ذہن سے بچ بچا کر سیدھا دل اور روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا یہ دعویٰ بھی بے جا نہیں کہ۔ ے

چہ منکر پہ اعتراض کولے نہ شی

دادے شعر دے رحمانہ کہ اعجاز

(ترجمہ: اے رحمٰن! یہ تیرا شعر ہے کہ اعجاز جس پر منکر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔)

رحمٰن بابا کا تعلق پشتونوں کے مہمند قبیلے سے تھا۔ اگرچہ وہ پشتونوں میں پہلا شخص ہے جس نے قبائلی بندھنوں سے انکار کیا اور یوں گویا ہوا ہے۔ ے

زۂ عاشق یم سروکار مے دے لہ عشقہ

نہ خلیل، نہ داؤدزے یم نہ مہمند

(ترجمہ: میں عاشق ہوں، میرا سروکار عشق سے ہے۔ میں نہ خلیل ہوں نہ داؤدزئی ہوں

اور نہ مہمند۔)

بہرحال اسی قبیلے کا ایک دوسرا بہت بڑا شاعر عبدالحمید مہمند ہے جس نے موشگافی اور نازک خیالی کا پشتو شاعری کو نیا ہبک دیا۔ اس نے اپنے میدان میں فارسی غزل کو چیلنج کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ۔ ؎

چہ هیچرے پہ فارسئ کښے موندۀ نۀ شی
هغه سازدے حمید ایښے پہ پښتو کښے

(ترجمہ: حمید کی وجہ سے پشتو کو وہ ساز نصیب ہوا ہے جو فارسی میں نہیں پایا جاتا۔)

فارسی بانو دحیرت گوتے پہ غاښ کړے
چہ حمید سخن سازی کړہ پہ پښتو کښے

(ترجمہ: جب حمید نے پشتو میں سخن سازی شروع کی تو فارسی بان حیرت زدہ رہ گئے۔)

اس کی نازک خیالی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دا زما لہ غمہ شین زړۀ
پکښے خیال دیار د شونډو
هسے رنگ زیب و زینت کا
لکہ مے پہ شنہ پیالہ کښے

(ترجمہ: یہ میرا غم سے نیلا دل اور اس میں لبِ یار کا خیال، ایسا خوبصورت لگتا ہے جیسے نیلے پیلے میں شراب۔)

خوشحال خٹک کے بیٹوں کے بعد اس کے پوتوں، پڑپوتوں اور لکڑپوتوں کی باری آتی ہے جنہوں نے پشتو غزل کو ادبی اور فنی حسن بخشا ہے۔ ان میں سب سے پہلا نام کامگار خٹک کا ہے

جو نہ صرف غزل کا شاعر ہے بلکہ غزل کی نئی ہیئت کا صورت گر بھی ہے۔ وہ اپنے دور کی غزل کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کامگار ۱۱۶۵ھ ہجری میں فوت ہوا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

چه جدا یم د دلبر له کښلی مخه
په هوا د غم د باد ځم لکه بخه
که مے سر په عشق کښے ځی پروا د ارنه یم
زهیر یږم د غماز سری په رخه

(ترجمہ: میں جو دلبر کے حسین چہرے سے جدا ہوں اس لیے مجھے غم کی ہوا تنکے کی طرح اڑائے جا رہی ہے۔ عشق میں اگر میرا سر بھی قلم کیا جائے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں البتہ رقیب کے طعنوں سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔)

کامگار کے بعد خانوادۂ خوشحال میں کاظم خان شیدا پیدا ہوا۔ یہ خوشحال خان خٹک کا پڑپوتا، افضل خان خٹک کا بیٹا ۱۱۴۰ھ ہجری کو سرائے اکوڑہ میں پیدا ہوا۔ اس شاعر نے فنی معیار پر پشتو غزل کو بام عروج تک پہنچایا۔ وہ اپنے گھرانے کے علاوہ رحمن بابا اور عبدالحمید ماشوخیل کے فن سے متاثر تھا۔ اس بارے میں اس کا ایک شعر ہے۔

په دا وخت کښے که شیدا دواړه مومند وے
ثنا خوان به د ومدام ستا د ویلـــو

(ترجمہ: اے شیدا! اگر اس زمانے میں دونوں مہمند (عبدالرحمن، عبدالحمید) زندہ ہوتے تو وہ تیرے کلام کے ثنا خوان ہوتے۔)

کاظم خان شیدا خاندانی ناچاقی کی بنا پر رامپور چلا گیا تھا جہاں ۱۱۹۴ھ ہجری میں وفات

پائی. اس کا ایک شعر ہے۔

د آفتاب پہ کمند نۂ خیژم آسمان تـہ

نۂ بزدم بار لکہ شبنم پہ دوش د گلـو،

(ترجمہ: میں آفتاب کے کمند سے آسمان پر نہیں چڑھتا اور نہ شبنم کی طرح پھول کے دوش پر بار بننا چاہتا ہوں۔)

سوال مے خوئی لہ ابرا نشانہ دومرہ نہ دے

صدف ورانہ خُلۂ کرہ پہ غـو بنـستـلـو،

(ترجمہ: یہ میری عادت نہیں کہ ابر نیساں سے سوال کروں، صدف نے مانگ کر اپنا منہ بگاڑ دیا۔)

پشتو غزل کے نئے علمی اور فنی اسلوب کا دوسرا بڑا شاعر علی خان ہے جو خٹک گھرانے سے تعلق رکھتا تھا[1]۔ علی خان پشتو غزل کی لطافت اور نازک خیالی کے فن کے اس اسلوب کا نمائندہ ہے جو کامگار خٹک نے شروع کیا تھا۔ اس کی زبان سادہ، سلیس اور روان ہے۔ اس نے خالص پشتو اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ اس کے کلام میں نادر تشبیہات اور استعارے موجود ہیں۔ اس کا ایک شعر ہے۔

خط دے وار د حُسن تیر کړو علی خانہ

کلہ مار د میږ تون سرو چلیږی

(ترجمہ: اے علی خان! اس کے خط سے چہرے کا حسن ماند پڑ گیا۔ سانپ، چیونٹیوں کے گھر سے آسانی سے نہیں گذر سکتا۔)

---

[1] مقدمہ علی خان (سید تقویم الحق کاکاخیل)

خوشحال خان کے خاندان کا ایک اور شاعر خوشحال شہید ہے جو افضل خان خٹک کا پوتا اور سعداللہ خان کا بیٹا تھا۔ یہ شاعر احمد شاہ ابدالی کی طرف سے مرہٹوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ کلام حسب ذیل ہے۔

چہ پہ ماندے دا یو ساعت کال کال دے
خبردار ئے لہ احوالہ ذوالجلال دے
لہ فراقہ بہ لا کلہ دے چہ مړ وم
چہ ژوندے ور بانندے پایم دیار خیال دے
پہ زمان زمان او بہ ور کوم ژړا پرم۔
پہ گوگل کښے نوے یار نو نہال دے

(ترجمہ: میرے احوال کے متعلق رب ذوالجلال جانتا ہے کہ ایک ایک گھڑی میرے لیے سال کے برابر لمبی ہے۔ میں فراق سے کبھی کا مر چکا ہوتا لیکن صرف خیال یار سے زندہ ہوں۔ میرے سینے میں نیا یار نیا نیا نہال ہے اس لیے وقفے وقفے کے بعد رو رو کر اسے سیراب کرتا ہوں۔)

خوشحال شہید کی شہادت کا سال حبیبی صاحب نے ۱۱۹۹ھ ہجری لکھا ہے[1]۔

پشتو کے بہت سے شعرا جو عبدالرحمان بابا کے سبک کے پیروکار تھے۔ ان میں عبدالرحیم ہوتک، احمد شاہ ابدالی، اخوند گدا، عبدالعظیم سواتی، میاں نعیم متیزئی، شیر محمد ہوتک، مطیع اللہ پیر خیل، قاسم علی افریدی، یونس، غفور، صدیق، شہنواز اور حافظ الپوری ہیں۔

عبدالرحمن بابا کے مکتب کے علاوہ عبدالحمید ماشوخیل کے مکتب فکر کے پیروکار شعرا

---

[1] مقدمہ علی خان (سید تقویم الحق کاکا خیل)

میں محمدی صاحبزادہ ۔ مرزا خان قندھاری ۔ حاجی عبداللہ مخدوم ۔ کاظم ، صمد ۔ ملا محمد اکرم اور قلندر پیر محمد وغیرہ کے نام ہیں ۔

ان شعرا کے علاوہ جن شعرا نے اخلاقیات ۔ تصوف اور عشق کو اپنے شعر میں اپنایا ہے ان میں قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں ۔

خواجہ محمد بنگش ۔ معری خاں گگیانڑی ۔ معز اللہ خاں مہمند ۔ میاں عبدل ۔ میاں قاسم ، حسین ، اشرف ، افضل ، عثمان ، مبین ۔ فتح علی ، فاضل ، عصام ۔ ابوالقاسم ، علیم ۔ ابراہیم سواتی ۔ غلام احمد ، عجب خان ، احمد شاہ ابدالی ، عبید اللہ خان ۔ اخون گدا ، شہنواز ، تیمور شاہ ۔ میاں نعیم ، بیدل حافظ الپوری ، علی نور ، صدیق ۔ عبدالعظیم ، قاسم علی افریدی ، دوست محمد ۔ خادم ۔ خان گل ۔ محمدی صاحبزادہ ۔ کاظم خان شیدا ، نجیب ، شمشیر ، صمد[۲۲] ۔

ان کے بعد جن شعرا نے عبدالرحمٰن بابا اور عبدالحمید ماشوخیل کی غزل کی روایات کو بحال رکھا ان کے نام یہ ہیں :

پیر محمد کاکڑ ، کریمداد ، عبدالکریم ، امیر خان ہجری ۔ عبداللہ سواتی ۔ علی اورکزئی ۔ نامدار ۔ انور اورکزئی ، رزق اللہ ، محتشم ، فیض کاکڑ ۔ بیاض جدون ، سرور شاہ ، رحمت داوی ۔ فاروق بابو جان ، وفا محمد سواتی ، اکرم ، سید محمد یار ، طالب رشید ، شیخ فرید ، میاں شرف ، محی الدین کاظم ، جان محمد ، نور محمد ، میاں کریمداد ۔

پھر اسی روایت کے مطابق جن لوگوں نے کلاسیکی روایات کے ساتھ پشتو غزل کو چودھویں صدی ہجری تک جاری رکھا ہے ، ان کے نام یہ ہیں[۲۳] ۔

---

[۲۲] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۴۴۶ ۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ۔

[۲۳] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۴۵۰ ۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ۔

محمد. مرزا خان. کلیم. خیر اللہ. شمس الدین. خداداد. میر عالم. فدوی عبدالرحیم. بشیر محمد. احمد جی، احمد تیراہی، لالا جی، رحمت پوپلزئی. رحمت سدوزئی. عبید اللہ. نادر یوسفزئی، احمد کلاچوی. شاہ غریب. صفی اللہ. محمد اسلم. سفید شاہ، حمید اللہ. خان لوانڑی، عبدالقادر، میاں عبدالحلیم. خیر اللہ عبدالرحمان، محمد زمان خان، غلام محی الدین. عبدالقدیر، احمد دین طالب. علامہ عبدالعلی، احرار. قاضی اموجان. عمر دین عمر. میاں خباب گل، احمد میاں، آزاد گل، دلسوز طوروی، غلام نبی۔

ان میں سے اکثر شعرا نے غزل اور ادبی اصناف کے علاوہ عوامی اور فولکلوری اصناف میں بھی کامیاب تجربے کیے ہیں. خصوصاً چاربیتہ کا صنف ایسا ہے جو ان دنوں عروج کو پہنچا۔

چودھویں صدی ہجری میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ غزل پس منظر میں چلی گئی اور فولکلوری اور عوامی ادب کی اصناف پر طبع آزمائی شروع ہوگئی[1]. پھر بھی کلاسیکی روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے شعرا نے غزل کو قطعاً نظرانداز نہیں کیا اور عوامی صنعتوں کے ساتھ غزل نے بھی اپنا سفر جاری رکھا. اگرچہ اس غزل میں وہ خوبی اور صنعت کاری نہیں پائی جاتی جو کلاسیکی اور فنی شاعری کا خاصہ تھا پھر بھی روایت کے تسلسل میں ان میں سے جن شعرا اور عوامی شعرا کے نام آتے ہیں وہ یوں ہیں۔

قمر دین، دوست علی، بہرام. شاہ پسند، میرا، میرباز. نورالدین، احمد گل، دلیل خان، نوروز، ملا نعمت اللہ، خان طالب. رستم. عبدالخالق. مصطفیٰ اخوند. غلام احمد، مسافر مروت. شریف. عبدالرحمٰن. طرہ باز، محمد دین. محمد نور، رمضان. توکل. عالم خان. جمعہ خان، احمد جان. علاؤالدین. عبدالسلام کاکڑ، برکت اعوان. سحر گل. سردار خان. مخلص. سید کمال. میران. میر ہاشم، شیر افضل، خانمیر. عید و خیل، زرجان، جانان. حمید گل. صدیق. محمد گل. خسرو. اختر شنواری.

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۲۵۱. ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

گلستان وغیرہ۔

اس سلسلے میں اپنے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے میں ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے لکھا ہے کہ پشتو ادب کے اس عوامی رنگ کے ساتھ کچھ کلاسیکی صفات بھی روایت کے طور پر شامل تھے۔ مگر ان شعرا کا زیادہ رجحان عوامی ادب کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ پشتو چار بیتہ نے ایک خاص زمانے میں جو شہرت حاصل کی تو وہ فولکلوری اصناف سے ادبی اصناف کی طرف آئی اور تیرھویں صدی ہجری کے شعرا نے مکمل ادبی خصوصیات کے ساتھ چار بیتہ کو اتنی ترقی دی کہ آج تک جس عوامی صنف نے غزل کا مقابلہ کیا اس میں چار بیتہ بھی شامل ہے۔ کیوں کہ چار بیتہ پشتو موسیقی کے ساتھ بندھا ہوا ایک ایسا صنف مانا گیا جس میں ثقافتی خوبیاں بھی تھیں اور ساتھ ہی اس میں قومی سیاست اور تشخص کی علامات بھی تھیں۔ چار بیتہ کی مقبولیت نے پشتو شاعری میں غزل کی مقبولیت کو دھندلا دیا۔

چار بیتہ کی نئی فنی صورت سکھوں کے دور کے بعد بہت مقبول ہوئی۔ اس زمانے میں جو ادبی تحریک چار بیتہ کے صنف کی شکل میں شروع ہوئی اس پر دو گہرے اثرات پڑے ایک تو قومی تحریکوں اور جہاد کا اور دوسرا عوامی شعرا کے درمیان بیت بازی کا اثر بھی پڑا۔ جنگ اور جہاد کے زمانے میں چار بیتہ کی تیز کمپوزیشن پشتونوں کے قومی مزاج سے ایسی موافق تھی کہ اس کے ذریعے رومانی اور جنگی جذبات ابھارے جا سکتے تھے۔ لہذا اپنی ہیئت کی بنا پر وہ پشتو موسیقی کا مستقل حصہ بنی۔ جو چار بیتے سکھوں کے خلاف جہاد کے دوران لکھے گئے تھے انھیں عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ اسی بنا پر تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں پشتو شاعری پر چار بیتوں کا راج تھا۔ اول تو چار بیتوں میں مجاہدین اور شہدا کے بہادری کے کارناموں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اس مقبولیت سے

فائدہ اٹھا کر شعرا نے چاربیتہ میں عشقیہ موضوعات کو بھی شامل کیا ۔

چاربیتوں کے اس دور کے تجزیے سے ایک خاص پس منظر کا پتہ چلتا ہے ۔ بہادری کے کارنامے ، تاریخی واقعات ، رومانی داستان اور عشق و محبت کی باتیں اس دور کے چاربیتہ کے مرکزی موضوعات ہیں ۔ اس کے بعد جس عوامی چاربیتہ نے فروغ پایا ہے اس میں طنز و مزاح ، معمہ سازی اور ایک دوسرے کے شعر کے مقابلے کے رجحانات جیسے مضامین نظر آتے ہیں ۔ اس دور میں شعر کی عوامیت علمی اور کلاسیکی اصناف کو اتنا پیچھے لے گئی کہ اس دور میں غزل کے کسی استاد کا نام بمشکل نظر آتا ہے ۔ اگرچہ اس دور میں ایک خصوصی ادبی تحریک کو فروغ ملا ۔ وہ یہ کہ دوسری زبانوں سے پشتو نظم میں ترجمے کیے گئے ۔

ڈاکٹر صاحب آگے رقمطراز ہیں کہ سکھوں کے تاریک دور میں پشتون ثقافت کے باقی پہلوؤں کے ساتھ ادب بھی اندھیروں کی نذر ہوگیا لیکن یہ ایک مختصر دور تھا ۔ جس کے بعد انگریز آئے ۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے دوران بھی ایک خصوصی شاعرانہ ادبی تحریک کو فروغ ملا ۔ جس جس سرحد پر بھی پشتونوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا ، ٹپوں ، بدلوں اور چاربیتوں کے رنگ میں پشتو شاعری میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس تحریک نے عوامی ادب کو زیادہ فائدہ پہنچایا لیکن جب انگریزوں نے اس سرزمین پر قدم جمائے تو اس سے بھی پشتو ادب کو فائدہ پہنچایا ۔ کیونکہ متواتر ایک سو سال تک نہایت شدت سے جو تحریک آزادی پشتونوں نے انگریزوں کے خلاف چلائی اس کا پشتو ادب پر خوشگوار اثر مرتب ہوا ۔

پشتو کی ادبی روایات میں کلاسیکی اصناف میں صرف غزل کو ترجیح دی جاتی تھی اور عالم لوگ اخلاقی اور صوفیانہ افکار کے اظہار کے لیے غزل لکھا کرتے تھے جو عبدالرحمن بابا

اور عبدالمجید ماشیوخیل کے دور سے شروع ہوا تھا لیکن عوامی اور سماجی حادثات پیش آنے پر عملی جدوجہد کی ضرورت نے اس روایت کو بدل دیا اور پشتونوں کے ملی تشخص کے لیے عوامی اصناف نے رواج پایا۔ جس میں پشتون مزاج اور فطرت کی عکاسی اس غرض سے کی گئی کہ اغیار کی غلامی سے نجات پائیں۔ عوامی شاعری کے عروج کے اس زمانے میں موبزی، نورالدین (نوردین) اور بعض دوسرے شعرا نے خاص نام پیدا کیا۔

اسی دور میں بعض شعرا نے پشتو میں دوسری زبانوں سے منظوم داستانوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا جو اپنے زمانے میں کافی مقبول ہوا۔ ایسے شعرا میں فیاض، ملا نعمت اللہ، مولوی احمد، امان گجراتی، عین اللہ، فاضل شاہ، ابراہیم شاہ، سید بوعلی شاہ، غازی الدین اور احمد جان وغیرہ شامل ہیں۔

پشتو شاعری کا چوتھا دور

بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں

پشتو شاعری کے عروج کا آخری دور بیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ اس کی بنیادیں صحافت پر استوار ہوئیں۔ اس سلسلے میں سید راحت زاخیلی کا نام پشتو ادب میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ نہ صرف پشتو کا پہلا ناول نگار اور پہلا افسانہ نگار ہے بلکہ پشتو کے پہلے صحافی کی حیثیت سے اس نے پشتو زبان و ادب کی بہترین خدمت کی۔ اس نے صحافت کے ذریعے پشتو ادب اور ادیبوں کی پذیرائی کی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سید راحت زاخیلی نے پہلی بار پشتو کا اخبار جاری کیا۔ سید راحت زاخیلی مرحوم ۱۹۰۲ء

ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس کا ادبی رجحان داستان نویسی کی طرف تھا
جس کا ایک شاہکار داستان سیف الملوک ہے لیکن عصری تقاضوں کی روشنی میں اس
نے پشتو زبان کو دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے سے روشناس کیا اور نئے ادبی
اصناف کی طرف توجہ دی۔

راحت صاحب کا "افغان" پشتو کا پہلا اخبار تھا جس نے ہفت روزہ کی صورت
میں پشتو صحافت کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دن تھے کہ سرحد میں صحافت کو فروغ حاصل ہوا
تھا اور جگہ بہ جگہ اُردو کے رسالے اور اخبار جاری ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ پشتونوں
کا رجحان بھی اُردو صحافت کی طرف تھا۔ ان دنوں لوگ اُردو پشتو کے مقابلے میں زیادہ
سہولت سے پڑھ سکتے تھے۔ اس سے پہلے بھی پشتو صحافت کی روایت تھی لیکن پشتو
ادبی صحافت کا سنگ میل راحت صاحب نے رکھا۔

"افغان" سے پہلے سکھوں کے دور میں پشتو صحافت شروع ہوئی تھی۔ سید احمد شہید
کی تحریک کے دنوں میں عبدالغفار پشاوری نے "الجہاد" کے نام سے پشتو کے ایک
صفحے کا اخبار جاری کیا تھا۔ "الجہاد" کی ادارت سوات کا مشہور غازی عبدالغفور کیا کرتا تھا۔
۱۹۱۵ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے دوران حاجی صاحب ترنگزئی نے علاقہ غیر میں
ایک لیتھو پریس بنایا جس میں جہاد کے پروپیگنڈے اور ترغیب کے لیے پشتو زبان کے
پمفلٹ شائع ہوا کرتے تھے اور چھپ چھپا کر پشتونوں میں بانٹ دیے جاتے تھے۔ یہ اگرچہ
اشتہار اور خصوصی مقصد کے پمفلٹ تھے لیکن صحافت کی تاریخ میں اس کا بڑا مقام ہے
کیونکہ اسی کے ذریعے پشتون دو صفحی تحریک سے واقف ہوئے۔ انہی دنوں چمرکنڈ کے مجاہدین
نے "المجاہد" کے نام سے پشتو کا ایک پرچہ ۱۹۲۳ء سے جاری کرنا شروع کیا جس کا مدیر

مولوی محمد بشیر تھا۔ اس پرچے کا مقصد قبائلی علاقوں میں برطانوی حکومت کے خلاف خبریں اور باقی مواد شائع کرنا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم میاں آزاد گل کاکاخیل نے مردان سے ہفت روزہ "افغان" جاری کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ عربی، اُردو اور فارسی میں تھا۔ لیکن مستقل طور پر ایک حصہ پشتو کا بھی ہوا کرتا تھا۔

پشتو کی ادبی صحافت کا علمبردار سید راحت زاخیلی کا اخبار "افغان" تھا۔ جس کا ایڈیٹر سید عبداللہ شاہ کاکاخیل تھا۔ راحت صاحب نے ۱۹۳۱ء میں "ستوری مشی" کے نام سے بھی ایک پشتو رسالہ جاری کیا۔ انھی دنوں اخبار "سرحد" نے بھی ایک حصہ پشتو کے لیے وقف تھا۔ جس کا مدیر مولانا عبد القادر مرحوم تھا۔ ایک رسالہ "پختون" کے نام سے جاری ہوا تھا جس کا ایڈیٹر عبدالخالق خلیق صاحب تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ صنوبر حسین مہمند مرحوم کا "سیلاب" اور "انگار" بھی قابلِ ذکر ہیں جس کا مدیر مشہور مرحوم امیر نواز جلیا تھا۔

اس کی ادارت بعد میں پیر عبدالقدوس نے کی۔ ۱۹۳۳ء میں "زلمی پختون" کے نام سے ایک پرچہ نکلا اور خانمیر ہلالی نے ۱۹۳۹ء میں "ہمدرد افغان" جاری کیا۔ محمد نواز خٹک نے پشاور سے ہفت روزہ "وطن" کا اجرا کیا اور جنگِ عظیم دوم کے دوران دہلی سے رسالہ "نن پرون" جاری ہوا جس کا ایڈیٹر مولانا عبدالقادر مرحوم تھا۔ بیرسٹر نصراللہ خان بھی اس کی ادارت کیا کرتا تھا۔

اس کے بعد پھر پشتو صحافت کا ایک ایسا سلسلہ چلا جو آج تک جاری ہے۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ انگریزوں کے پاس وسائل کی بہتات تھی۔ وہ صحافتی پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کیا کرتے تھے۔ انگریزوں کے مقابلے میں آزادی پسند تحریکوں نے صحافت کی ضرورت محسوس کی۔ اسی لیے ایسے اخبار اور رسالے جاری ہوئے جس نے ہر تحریک

کا پروپیگنڈہ شروع کیا ۔

سیاسی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت کے لیے بھی رستہ پیدا ہوا اور غیر سیاسی لوگوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے کتابی ادب کی بجائے صحافتی ادب سے کام لینا شروع کیا کیونکہ یہ ایک آسان اور مؤثر ذریعہ تھا۔ ایسے رسالوں میں خالص صحافتی مواد شائع ہوتا تھا جو صحافت کے ساتھ ساتھ ادب کے ذریعے بھی لوگوں کو سماجی برائیوں سے آگاہ کرے ۔بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ یہ ایک انقلابی دور تھا ۔زمانے کے تقاضوں کے سبب اُردو زبان نے بہت ترقی کی تھی ۔جس نے انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے کافی استفادہ کیا تھا۔ان دنوں میں جبکہ ادبی اقدار مکمل طور پر بدل گئے اور ایک نیا ادبی معیار سامنے آیا تو پشتو ادبا اور شعرا میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے ادبی اجتہاد کے ذریعے پشتو زبان کو بھی ترقی یافتہ زبانوں کی قطار میں کھڑا کیا ۔

ان دنوں پرانے کلاسیکی اصناف پس پشت ڈالے گئے ۔اسی لیے کہ نئے ادبی اصناف کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ داستان کی جگہ ناول نے لے لی ۔ انشائیے، مضمون نویسی اور رپورتاژ نے صحافتی ادب کے ذریعے ترقی کی ۔پشتو میں یہ اصناف بہت کم تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے ۔ ان دنوں پشتو ادب کے ستون سید راحت زاخیلی نے پشتو زبان کو نئے ادبی اصناف سے آشنا کرنا شروع کیا ۔پشتو ادب نے بھی اُنھی رجحانات کو اپنایا جو ان دنوں ترقی یافتہ زبانوں کے تھے ۔ اس سلسلے میں اسلامیہ کالج پشاور کے "خیبر میگزین" نے بھی بڑا کردار ادا کیا ہے ۔

پشتو ادب میں بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ،ادبی صحافت کی تحریک اس لیے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس تحریک میں ان ادبا اور شعرا نے حصہ لیا جنھوں

نے پشتو کے ادبی ارتقا میں اور بھی بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ صحافتی تحریک اگرچہ تیز نہ تھی اور نہ ہی اس نے اتنی ترقی کی ہے جتنی دوسری زبانوں کی صحافت نے کی ہے، مگر اس تحریک نے یہ ضرور ثابت کیا کہ صحافت کے لیے پشتو میں بھی ایک وسیع میدان موجود ہے۔ اگر اس کی سرپرستی کی جائے تو صحافت کے ذریعے پشتو صحافت بھی اس مقام تک پہنچ سکتی ہے جہاں تک باقی ادبیات پہنچے ہیں۔ بلکہ ایک زبان صحافت کے ذریعے اس لیے زیادہ ترقی کر سکتی ہے کہ صحافت وہ واحد ذریعہ ہے جو روزمرہ کے ادبی رجحانات عوام تک پہنچانے کے قابل ہے اور ایک علاقے کے تمام ادبا و شعرا ایک ہی پرچے میں ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں۔ تازہ کلام، تازہ تخلیق اور تحقیق بھی اسی کے واسطے سے سامنے آتی ہے۔ ادبی صحافت ایک زبان کے ادب کے لیے اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ اخلاقی خوبیاں بھی صحافت کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔

انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکوں کے دوران پشتو شاعری میں زیادہ تر ہنگامی موضوعات کا رواج تھا۔ ہنگامی تقاضوں کی روشنی میں پشتو شعرا کا قلم مجاہدین کی تلواروں کے دوش بدوش چل رہا تھا۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اپنے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے میں رقمطراز ہے کہ خالص رومانی ادبی موضوعات بھی اسی تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔ آزادی اور آزاد خیالی پشتون فطرت کا ایک تاریخی جزو ہے اس لیے کہ پشتون ثقافت ہمیشہ سے ایک تاریخی جنگی کشمکش سے آشنا رہی ہے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ آزادی اس تاریخی ارتقائی سلسلے کا نقطہ عروج تھا۔ ان دنوں پشتو شاعری کا زیادہ حماسی موضوعات پر مشتمل رہا ہے۔

خوشحال خان خٹک نے جس حماسی شاعری کی ابتدا کی تھی اس کا شعور اُن دنوں

تیزی سے اجاگر ہوا۔ اس شعور میں احساس خودی کا زیادہ دخل تھا۔ جو احساسات زمانے کے گرد و غبار کے سبب لاشعور کے اندھیروں میں اترتے تھے وہ تحریک آزادی کے سبب شعور میں آنے اور شاعری کے رنگ میں اس شعور نے اپنے آئیڈیل خوشحال خان خٹک کے عکس اور تصویر کی لکیروں کو تازہ کیا۔

جب غلامی کے اندھیرے چھٹ گئے اور قوم آزاد ہوئی تو پشتون شعرا نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اس وقت پشتون شعرا کو پشتو ادب کے فروغ کا موقع ملا۔ بنابریں ۱۹۴۷ء کے بعد ایک خصوصی ادبی تحریک شروع ہوئی اور یہ پشتون زبان و ادب کے سلسلے میں خوشحال خان خٹک کے مکتب فکر کے احیا کی تحریک تھی۔

بقول ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک خوشحال خان خٹک کے مکتب میں علم و فن کے ہنر کے حصول کی تحریک کے تقاضے ایسے تھے کہ ہر قسم کا علم پشتو میں متعارف کرایا جائے۔ پشتو میں ہر اس مضمون کا بندوبست کیا جائے جو اس میں نہیں ہے۔ ہر فلسفہ اور ہر فکر کو پشتو میں لایا جائے تاکہ یہ ایک علمی اور عالم قوم کی زبان بنے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جب پشتون شعرا نے قوموں کی ترقی کو دیکھا اور ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی معیار کا جائزہ لیا تو ہر اس صنف شاعری کو پشتو زبان میں متعارف کرنے کی کوشش کی جو عالمی طور پر مقبول تھی۔

ان سب شعرا کا مقصد پشتو زبان کی ترقی تھی۔ پشتونوں کے ہر علاقے میں ادبی جرگے بنے۔ صحافتی تحریک نے ترقی کی اور اب جرگوں میں پشتو کے نامور ادبا و شعرا شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے غلامی کے اندھیرے بھی دیکھے تھے اور اب آزادی کی روشنی میں ان کو اپنے مقصد کی تکمیل کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا۔ ان لوگوں میں ایسے اساتذہ شعرا شامل تھے جنھیں قدرت نے خاص اس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان لوگوں میں ہر خیال و فکر کے آزاد

شامل تھے اور شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود پشتو زبان و ادب اور شاعری کی ترقی کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتے تھے۔ ان ادبی جرگوں کی وجہ سے ایسے علمی مباحثے اور تنقیدی نشستیں شروع ہوئیں جن کے ذریعے نئی شاعری کے لیے رستہ ہموار ہوا۔ کیونکہ تنقید کے ذریعے ایک خوبصورت تعمیری ادب کی تخلیق کے لیے ماحول میسر آتا ہے۔ ان ادبی جرگوں سے پہلے پشتو ادب کا رجحان عوامیت کی طرف تھا۔ ان دنوں پشتو زبان کی شاعری میں عصری علوم اور نظریات کا اثر کم تھا۔ ان ادبی جرگوں نے ادبی موضوعات کے معیار کے لیے ادبی۔ علمی تنقید کا رستہ ہموار کیا۔ اسی تنقید کے ذریعے پشتو شاعری ایک اونچے معیار تک پہنچی۔

اسی زمانے میں ان جرگوں نے پشتو ادب میں فلسفہ۔ علم، مذہب۔ سائنس اور باقی موضوعات کو شامل کر کے عصری ادب کے تقاضے پورے کرنے شروع کر دیے۔ ویسے تو ان جرگوں کے افراد میں بڑے بڑے علما، ادبا اور شعرا شامل تھے جو اپنے اپنے اسلوب اور اور طرز کے لیے مشہور ہیں پھر بھی ادب میں وحدت اور اشتراک لانے کی انھوں نے آپس میں مصلحت اور مصالحت سے کام لیا۔

ان ادبی جرگوں کی تحریک کے ساتھ ساتھ ان اساتذہ کے احساسات کو بھی جلا ملی جو بہت خلوص سے پشتو زبان کی خدمت کرتے تھے اور انفرادی طور پر پشتو ادب کو اس مقام تک پہنچانا چاہتے تھے جو خوشحال خان کے مکتب نے قائم کیا تھا۔ ان دونوں قسم کے لوگوں میں راحت زاخیلی، عبدالخالق خلیق، عبدالاکبر خان اکبر، مولانا عبدالقادر، صنوبر حسین مومند، علامہ عبدالعلی مرحوم۔ عبدالمجید افغانی، عمر دین۔ مخفی۔ محمد اسلم کمالی۔ فضل اکبر بے نوم۔ محمد اکبر خادم۔ مولانا عبدالرحیم، میاں احمد شاہ، جعفر حسین رشتونے۔ عبدالمالک فدا۔ ملک سیدا خان، شنواری۔ فضل احمد غر، سمندر خان سمندر، صاحبزادہ محمد ادریس۔ محمد نواز خٹک، شیر محمد مینوش۔

سید انوار الحق، سید رسول رسا، فضل حق شیدا، اور میاں سید تقویم الحق کاکاخیل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی مقصد کے حصول کے لیے جہاں پاکستان کے پشتو شعرا معروف عمل تھے تو دوسری طرف افغانستان کے شعرا و ادبا بھی منظم طور پر پشتو شعر و ادب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے معروف عمل تھے۔ ان لوگوں میں محمد گل خان مومند، استاد الفتہ حبیبی، عبدالرؤف بینوا، قیام الدین خادم، صدیق اللہ خان رشتین، گل باچا الفت، محمد گل نوری اور کچھ دوسرے شعرا شامل ہیں جن کی کوششوں سے کابل کی پشتو اکیڈمی بنی تھی۔

ان دنوں پشتو ادب تین مکاتب فکر میں تقسیم تھا۔ جن میں سے ایک عروضی مکتب تھا۔ دوسرا صوفیانہ اور تیسرا سیاسی۔ مگر ان سب نے اپنی الگ الگ حیثیت میں پشتو شاعری کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔

اٹک کے اس پار میں پشتو ادب کی ترقی کے لیے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی کافی حصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ان دنوں اس حلقے کی نمائندگی سید رسول رسا اور فضل حق شیدا کر رہے تھے۔ جن کے سامنے پشتو شعر و ادب میں انگریزی یا دوسری یورپی ترقی یافتہ زبانوں کے معیار کا حصول تھا۔ انھوں نے ایک نیا مکتب فکر بنایا تھا کہ پشتو میں جمالیاتی فن کا انداز انگریزی ادب کے فن کے ساتھ ملایا جانے تو اس طرح سے پشتو ادب ترقی کرے گا اور عربی فارسی کے علاوہ پشتو میں یورپی زبانوں سے استفادے کے رستے کھل جائیں گے۔

اٹک کے اس پار کے مقالہ نگار کی رائے کے علاوہ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کی رائے کے مطابق اس سلسلے میں کچھ اور لوگ بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے انگریزی ادب کے کچھ علمی کاموں کی تقلید کا رستہ ہموار کیا ہے۔ ان لوگوں میں ادبی تنقید کے معیار کے لحاظ

سے پروفیسر قلندر مومند کا نام ان لوگوں کا نمائندہ ہے جنھوں نے پشتو میں تنقید کی طرح انگریزی طرح پر رکھی۔

اس کے علاوہ اس سلسلے میں عبدالغنی خان غنی کا نام آتا ہے جو ان دنوں کے تعلیم یافتہ افراد میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ اپنے فن اور انداز کے لحاظ سے غنی خان پشتو کا ایک ایسا شاعر ہے جس نے خیال و فکر کا اپنا الگ مکتب قائم کیا۔ غنی خان کے انداز میں خصوصی بات اس کے طنز و مزاح کی ہے مگر اس کا کلام ایک ایسی سنجیدگی کا حامل بھی ہے جس میں احساس اور درد کی شدت ہے۔ غنی خان نے ہر چند کہ انگریزی ادب سے استفادہ کیا ہے پھر بھی اس نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ پشتو شعرا اپنے مزاج کے مطابق اپنے ہی آہنگوں پر استوار ہو۔ غنی خان نے کلاسیکی رستہ یکسر بدل دیا اور فوکلوری آہنگوں یا عوامی شاعری کے ان میٹروں کو اپنایا جو چستی اور تیزی کے لحاظ سے ساز کے لیے زور داری اور تندی رکھتے ہیں۔ غنی خان پشتو کے چار بیتے کے آہنگ سے متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری ہر چند کہ معانی کے لحاظ سے بہت گہری اور مشکل ہے پھر بھی وہ نظم کا شاعر ہے اور فوکلوری آہنگ کا قائل ہے۔ اپنا خصوصی فلسفہ اپنے انداز سے نظم میں سمویا ہے اور نظم کے لیے بھی خصوصی بحر نکالے ہیں۔ وہ ایک منفرد شاعر ہے جس کی تقلید مشکل ہے[1]۔

پشتو زبان و ادب اور شاعری کی حقیقی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب ۱۹۵۵ء میں پشتو اکیڈیمی قائم ہوئی اور مولانا عبدالقادر مرحوم اس کا بانی ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ مولانا مرحوم طالب علمی کے زمانے سے پشتو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے سرگرم تھے۔ جہاں بھی رہے جدھر بھی رہے اس کے سامنے سب سے بڑا مقصد پشتو زبان کا تھا۔ وہ چونکہ

[1] پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ ۵۲۳۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔

بیک وقت عربی، فارسی، انگریزی، اُردو اور پشتو زبان کے عالم تھے۔ اسی لیے ان کے سامنے نظم اور نثر دونوں کا معیار پشتو میں بھی اسی حد تک لانا تھا جو ان ترقی یافتہ زبانوں میں تھا اور اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع اسے اپنے کیریر کے آخری دنوں میں اس وقت ملا جب اس نے پشتو اکیڈیمی کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مختلف افراد اور جرگوں نے پشتو زبان و ادب کے سلسلے میں بہت بڑے کارنامے انجام دیے تھے مگر ضرورت ایک خاص ڈسپلن کی تھی جو پشتو اکیڈیمی کے قیام سے پہلے موجود نہیں تھی۔ پشتو اکیڈیمی کے قیام کے بعد زبان کے ہر پہلو میں ایک خاص نظم و ضبط کا لحاظ رکھا جانے لگا۔ کیونکہ پشتو اکیڈیمی نے اپنی زیر نگرانی اگر ایک طرف صرف ان پشتون شعرا کے کلام کو چھاپنا اپنا دستور العمل بنایا جن کی شاعری ہر لحاظ سے فنی معیار پر پوری اترتی تھی تو دوسری طرف اپنے سہ ماہی رسالہ "پشتو" میں چھاپنے کے لیے بھی نظم و نثر دونوں میں ایک خاص معیار کو شرط ٹھہرایا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مولانا عبدالقادر نے پشتو زبان و ادب کے لیے پہلے ایک معیاری نصاب پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر اُسی نصاب کو بنیاد بنا کر شعبۂ پشتو کی صورت میں پشتو کے ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے لیے راستہ کھول دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کے تمام کالجوں میں پشتو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جانے لگی۔

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مولانا مرحوم نے اس معیار کے حصول کے لیے صرف پشتو اکیڈیمی اور شعبہ پشتو میں ہی نہیں بلکہ سب پشتو لکھنے والوں کے لیے تربیت کا التزام کیا۔ یہ تربیت وہ خاص انداز میں دیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کی شخصیت اور علمیت کا پشتو زبان و ادب پر گہرا اثر مرتب ہوا۔

مکمل طور پر میدانِ پشتو میں اس کے آنے کا اثر یہ ہوا کہ اس کے ہزاروں دوست احباب، مداح اور شاگرد جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے مولانا کی وجہ سے انھوں نے بھی پشتو کی طرف توجہ دی۔ یہ لوگ اس سے پہلے ایک خاص قسم کی احساس کمتری کا شکار تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ نہ صرف یہ کہ پشتو کوئی معیاری زبان نہیں ہے بلکہ پشتو لکھنا پڑھنا ان کے خیال میں بے علمی کی نشانی تھی۔ ان کا اثر جدید نوجوان تعلیم یافتہ طبقے پر بھی پڑتا تھا اور اکثر نوجوان پشتو ادب سے دور بھاگتے تھے۔

یہی چیز پشتون شعرا و ادبا کے لیے جان کا روگ بنی ہوئی تھی۔ وہ ہر چند کہ اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے تھے اور ہزاروں حوصلہ شکنیوں کے باوجود اپنے مسلک سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے لیکن اقلیت میں تھے اس لیے ایک طرف تو وہ پشتو زبان کی مارکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے مار کھا جاتے تھے اور دوسری طرف وہ دل کا خون بہا کر جو ادب تخلیق کرتے تھے اس کے قاری نہ ہونے کے برابر تھے۔

پشتون شعرا اور ادبا جن میں اس وقت تک جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہوئے تھے اور اکثر پشتون جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان ایک ایسا بعد المشرقین تھا کہ کسی طرح سے بھی ان کے درمیان افہام تفہیم ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

مولانا عبدالقادر مرحوم کی پشتو اکیڈمی میں آمد نے جادو کا کام کیا۔ ان دونوں دھڑوں کے درمیان مولانا کی صورت میں ایک پُل قائم ہوا۔ نہ صرف باہمی افہام و تفہیم ہوئی بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت نے پشتو زبان و ادب میں گہری دلچسپی لینا شروع کی۔ پشتون شعرا کو سوسائٹی میں وہ مقام ملنے لگا جس کے وہ عرصے سے حقدار تھے اور آج تو حالت یہ بنی ہے کہ صوبہ سرحد کے صوبائی سکرٹریٹ میں جو اعلیٰ افسران بیٹھے ہیں وہ پشتون شعرا سے

سے بھی زیادہ پشتو زبان وادب کے دعویدار ہیں۔

اس سب کچھ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کی پشتو شاعری کا معیار کافی اونچا ہوگیا ہے فیض احمد فیض نے کئی سال پہلے ایک موقع پر کہا تھا کہ فنی زمانہ اوریجنل تھانس ORIGINAL THOUGHTS صرف پشتو شاعری ہی میں ملتے ہیں۔ آج کی پشتو شاعری نہ صرف فکری لحاظ سے بہت بلندی پر ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی معیاری ہے۔ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ساتھ نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ لوگ بھی کثیر تعداد میں شاعری کرتے ہیں لیکن اعلیٰ معیار سب کے مد نظر رہتا ہے۔

پشتو اکیڈمی کے قیام سے پہلے گذشتہ بارہ سو سال میں پشتو شاعری کی جتنی کتابیں چھپی تھیں، پشتو اکیڈمی کے قیام کے بعد گذشتہ تیس سالوں میں اس سے کہیں زیادہ کتابیں چھپی ہیں۔ جس سے میری بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

پشتون شعرا غزل، قطع، رباعی، مخمس، مسدس، ہر قسم کی نظم اور آزاد نظم میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ آج پشتو کی شاعری مقبولیت کے لحاظ سے بھی بام عروج پر ہے اور مواد اور معیار کے لحاظ سے بھی۔

ایسا کوئی موضوع نہیں جو آج کے پشتو شاعر کی دسترس سے باہر ہے اور ایسا کوئی انداز نہیں جو دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان کے شعرا نے اپنایا ہو اسے پشتون شعرا نے اپنی زبان میں متعارف نہ کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے پشتون شعرا کی اکثریت دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے واقف ہے اور وہ دنیائے شاعری میں روزمرہ کی تبدیلیوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ وہ ان زبانوں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے صحیح جذبات واحساسات کے اظہار کی صورت میں دوسروں کے سامنے نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔

گوشۂ خوشحال خان خٹک

عظیم شاعر کی زندگی اور فکر و فن

قصور کیا ہے ترا جو کبھی معاف نہ ہو
زمانہ تجھ سے ہمیشہ نظر چرا تا رہا
کسی نے سننا نہ چاہا کوئی سمجھ نہ سکا
میں تیس سال تری داستاں سناتا رہا

(پریشان خٹک)

مجھے مندرجہ بالا قطعہ لکھنے کی ضرورت اپنے تیس سالہ تجربات کی روشنی میں پیش آئی۔ وہ اس لیے کہ اگرچہ خوشحال خان خٹک کو غیروں نے پہچان لیا مگر اپنے اسکے متعلق شکوک و شبہات کے شکار ہیں۔ ایسی ہستی جس ملک میں دفن ہے اُسے اپنی خوش بختی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ مگر والئے حسرتا کہ جسے علامہ اقبال نے آج سے تقریباً اسّی سال پہلے اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ پہچانا تھا اور اُس کے بارے میں یہ ارشاد کیا تھا کہ ؎

خوش سرود آں شاعرِ افغاں شناس
ہر چہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیم ملّتِ افغانیاں
آں طبیبِ علّتِ افغانیاں
رازِ قومے دید و بیباکانہ گفت
حرفِ حق با شوخئ رندانہ گفت[1]

---

[1] جاوید نامہ۔ علامہ اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع ہفتم، صفحہ ۱۰۰۔ جون ۱۹۷۰ء

اُسے آج بھی اپنے ملک میں اُس حیثیت سے نہیں پہچانا گیا۔ کچھ لوگوں نے صرف اس کا نام سُنا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اُسے قطعاً غلط رنگ میں پہچانا ہے۔ شکوہ تو اِس بات کا ہے کہ ایک انگریز مستشرق سر اولف کیرو خوشحال خان خٹک کے بارے میں یُوں رقمطراز ہے:

"وہ پشتونوں کا پشتون ہے۔ باوجود تمام کمزوریوں کے ایسا شاندار آدمی ہے کہ انسان کو اُس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے اور ساتھ ہی اِس بات پر مجبور رہتا ہے کہ اُس سے محبت کرے۔ اُس کی پہچان اُس شخص کے لیے جو پشتونوں کو پہچاننا چاہتا ہے ابتدا ہے۔"[1]

جادُو ناتھ سرکار لکھتا ہے کہ: "ایک اکیلا شخص جس کی ایک عظیم اور طاقتور حکومت نہ صرف مخالف ہو بلکہ اُسے کچلنے کے لیے تمام ذرائع بروئے کار لائے اور ساتھ ہی اپنا قبیلہ اُس کی مخالفت میں کھڑا ہو حتیٰ کہ اپنی اولاد تک بدترین دشمنی پر اُتر آئے۔ گھر، گاؤں، منصب، جاگیر، قبیلہ، ریاست سب کچھ سے ہاتھ دھو بیٹھے پھر بھی اسّی سال کی عمر میں اُس کا حوصلہ نہ ٹوٹے تو وُہ خوشحال خان خٹک ہو گا۔"[2]

جارج مارگنسٹرن نے اپنے ایک پیغام میں لکھا ہے کہ: "نصف صدی سے مَیں خوشحال کے کلام کا مطالعہ کرتا آرہا ہُوں اور متواتر لُطف اندوز ہو رہا ہُوں۔ خوشحال کو حق حاصل ہے کہ اپنے آپ کو پشتو کا فردوسی اور سعدی سمجھے۔ پشتو زبان کی جو خدمت اُس نے کی ہے کسی نے بھی کبھی نہیں کی۔ پشتونوں کا اس سے بہتر رہنما کوئی نہیں۔ یعنی دیندار اور باپ کی طرح شفیق۔ بہادر اور سخت گیر۔ اُس کا کلام اُس میٹھے چشمے کی مانند ہے جو پتھر کے دل سے اُبلتا ہو۔ وُہ پتھر جو حالات کے بے پناہ طوفانوں نے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ کلام کسی کو پسند نہ آئے اور اس کے کہنے والے سے محبت نہ کرے۔ مَیں مغرب کے ایک فرزند کی حیثیت سے اور مغرب کے ایک بڑے اُستاد کی حیثیت سے خوشی محسوس کرتا ہُوں کہ اب خوشحال خان خٹک مغرب میں اچھی طرح سے روشناس ہو گا۔"[3]

---

[1] دی پٹھانز۔ اولف کیرو ص ۲۳۶
[2] ہسٹری آف اورنگزیب۔ جادو ناتھ سرکار۔ جلد سوم۔ ایم سی سرکار اینڈ سنز کلکتہ ۱۹۲۵ء
[3] تنکیلے پشتون۔ جارج مارگنسٹرن کا پیغام۔ صفر ل۔ کابل ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۶۶ء

پروفیسر صدیق اللہ خان رشتین نے لکھا ہے کہ: "خوشحال خان خٹک فصاحت میں حضرت حسانؓ کا پیرو ہے۔ رزمیہ میں فردوسی، اخلاقی شاعری میں حضرت سعدی، فلسفہ میں خیام، عشق و تصوف میں حافظ شیرازی، عشرت میں بونواس اور فطرت کی خوبصورتی کا مفسر ہے۔"[1]

مندرجہ بالا حوالوں کی طرح ہم وہ تمام حوالے نقل کرنے لگیں جو غیر پاکستانیوں نے خوشحال خان خٹک کے بارے میں دئیے ہیں تو بات اتنی لمبی ہو جائیگی کہ اپنے مقصد کی طرف پلٹنا ممکن نہ رہے گا۔ اسی لیے میں اس سوال اور شکایت کا حق محفوظ رکھتا ہوں کہ ایک پاکستانی نابغہ کو اگر بیرون پاکستان اس حیثیت میں پہچانا جاتا ہے تو خود خاک وطن پہ رہنے والوں میں علامہ اقبال مرحوم کے بعد اس زمرے میں کتنے لوگ شامل ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی کے مختصر حالات سے قارئین کو آگاہ کیا جائے۔ اور اس کے بعد اس کی زندگی سے متعلق ایک غیر جانبدارانہ حقیقت پسندانہ تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے۔ تاکہ لوگوں نے جو تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اس کی تلافی ہو جائے۔

---

[1] ننگیالے پشتون۔ جارج مارگنسٹرن کا پیغام صفحہ ۲۔ کابل ۱۳۵۷ مطابق ۱۹۷۷ء

خوشحال خان خٹک کی سوانح حیات

خوشحال خان خٹک کی شاعری پر چند الفاظ لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا بھی مختصر خاکہ دیا جائے۔

پشتون قبائلی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہی قبائل میں ایک قبیلہ خٹک کا بھی ہے۔ ابھی تک جتنی بھی تاریخی شواہد کا پتہ چلا ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی پُرانا قبیلہ ہے۔ پشتونوں کے جن چند بنیادی قبائل کا ذکر زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے، انہی میں سے ایک خٹک قبیلہ بھی ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ایران کی ہخامنشی حکومت پہلی حکومت ہے جس کا دائرہ اثر پشتونوں کے علاقے تک بھی تھا۔ دارا نے پتھر کی ہموار کی ہوئی تختیوں پر کتبے لکھے ہیں جن میں اپنی حکومت کے علاقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہی میں سے ایک کا نام تتہ گش ہے جو پرانی فارسی کا لفظ ہے۔

اکثریت کی رائے یہ ہے کہ تتہ گش کے رہنے والے دراصل آج کے خٹک ہیں۔[1]

تاریخ خٹک کے مندرجہ بالا اقتباس کی صحت پر شبہ نہیں۔ مگر اس سے یہ تردد ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مورخین اس پر متفق ہیں کہ خٹک ایرانی حکومت کے زیر تسلط نہیں تھے اور دوسری طرف تتہ گش کو دارا اپنی حکومت کا علاقہ بتاتا ہے۔ البتہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں آج کی طرح منظم حکومتیں نہیں تھیں۔ بادشاہ کی افواج اگر کسی علاقے کے صرف رستے سے بھی گزر جاتی تھیں تو بادشاہ یا شہنشاہ اُس علاقے کو اپنی عملداری میں شامل کرنے پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ یا اگر ان علاقوں کے روابط کسی بڑی حکومت سے مخالفانہ نہیں ہوتے تھے تو باوجود ان کی اندرونی مکمل آزادی کی بحالی کے بادشاہ ان چھوٹے چھوٹے علاقوں کو اپنی سلطنت کا حصہ بتاتے تھے۔

---

[1] تاریخ خٹک از سرفراز خان عقاب خٹک ص ۹۲

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

ستاگیدی

اس نام کا تلفظ ستاگودائی بھی کرتے ہیں۔ یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس (۴۸۴ - ۴۲۶ ق م) اپنی کتاب ۳: ۹۱ میں تھتہ گش کی جگہ ستاگودائی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ہخامنشی بادشاہ دارا کے صوبوں کے بیان میں لکھتا ہے: [1] "ستاگودائی (خٹک)، گندھاری (گندھاری)، دادیکائی اور اپیروتائی (اپریتی۔ افریدی) سب اکٹھے گنے جاکر ایک سو ستر ٹیلنٹ ادا کرتے تھے۔ یہ ساتواں صوبہ تھا۔"

"ستاگودائی پرانی فارسی زبان کے لفظ تھتہ گش کی معرّف یونانی صورت ہے۔ یہ لفظ دو ٹکڑوں سے مرکب ہے ستا۔ سو اور گودائی وغوایان (بیلوں) کا مالک۔ پس اس کے معنی ہوئے سو بیلوں کا مالک یعنی بہت مالدار۔ کیونکہ اُس زمانے میں لوگوں کی دولت مال مویشی میں گنی جاتی تھی۔ اس لقب سے معلوم ہوتا ہے کہ خٹک اس زمانے بھی بہت ہی مالدار اور طاقتور قبیلہ تھا۔" [2]

"ہیرو دوت نے لکھا ہے کہ اُس وقت پشتونوں کے متذکرہ بالا چار صوبوں کے بادشاہ کا نام آرتینت تھا۔ دادیکان خٹکوں کے جنوب میں رہتے تھے۔ خٹکوں کا ملک ایک طرف سے گندھاریوں کے ملک سے ملحق تھا۔"

"ستاگیدیوں [3] کا ذکر بطلیموس نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اور عیلام اور بابل کے مؤرخوں نے بھی اور انہیں ستاگوئی اور ست گوسو کے نام سے یاد کیا ہے۔"

"ستاگیدی [4] اراکوزی کے لوگوں سے بھی ملتے تھے اور فرانسیسی محقق اندریو بارتلو کہتا ہے کہ ستاگیدی پاروپانیزاور ہند کے شمالی حصہ اور اس جگہ میں بستے تھے جسے اب غزنی کہتے ہیں۔"

"راونسن [5] کہتا ہے کہ ایک ایسی اونچی جگہ پر بستے تھے جس کی چوڑائی ایک طرف کو ہرات سے

---

[1] تاریخ خٹک، از خٹک عقاب ص ۹۳ ۔ [2] تاریخ خٹک، از عقاب خٹک ص ۹۳
[3] تاریخ خٹک، از عقاب خٹک ص ۹۳ ۔ [4] تاریخ خٹک، از عقاب خٹک ص ۹۳
[5] تاریخ خٹک، از عقاب خٹک ص ۹۳

کابل تک اور دوسری سمت کو سرپل سے ہلمند کے کناروں تک تھی۔ یعنی کہ آریانا کے مرکزی پہاڑی علاقوں اور کوہستان میں ان کی بود وباش تھی۔ یہ لوگ کھال کے کپڑے پہنتے تھے اور اپنے جسموں کا بالائی حصہ اور رانیں اکثر ننگی چھوڑتے تھے۔ سیدھی کوتاہ تلواریں اور تیر کمان پھراتے تھے۔ تلواریں میانوں میں رکھتے تھے اور میانوں کا تسمہ کندھوں پر ڈالتے تھے۔"

بیلیو (دی ریسز آف افغانستان ص ۸۵ اور ۹۰) میں لکھتا ہے کہ یہ ستاگودائی خٹک ہیں۔ خٹکوں کی زبان آوستا سے ملتی جلتی ہے اور پشتو میں خٹک کا تلفظ شتک ہوسکتا ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ پہلے خٹک کا تلفظ شتک ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ آوستا میں "خ" کا حرف نہیں ہے اس لیے وہ اس لفظ کا تلفظ خٹک کرتے تھے۔ راورٹی نے بیلیو کے استدلال پر اعتراض کیا ہے۔

کیرو (ص ۳۸) دونوں سے دوسری طرف بہک گیا ہے۔ نرم لہجے یعنی پشتو میں "خ" کا "ش" میں بدلنا مانتے ہوئے وہ ص ص ۳۸۔۳۹ پر لکھتا ہے کہ خٹک ہرگز اپنے آپ کو شتک نہیں کہتے۔" اس کے بعد لکھتا ہے (ص ۳۹) "راورٹی اور بیلیو بھول گئے تھے یا بالکل نہیں جانتے تھے۔ شینک کی بابت۔"

اس موضوع پر تاریخ خٹک سے مندرجہ بالا اقتباس کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس پر اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو پشتونوں کو بنی اسرائیل ثابت کرتے ہوئے قیس عبدالرشید کی اولاد سمجھتے ہیں وہ جب بھی پشتونوں کی بات کہتے ہیں تو خٹک قبیلے کی طرح ہر قبیلے کی تاریخ ہزاروں سال تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن پشتونوں کے مورث اعلیٰ قیس عبدالرشید صرف چودہ سو سال پہلے کے زمانے کے آدمی ہیں۔ ؎

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

خٹک کا کوچ

عام خیال اور ناموں کی مشابہت کی بنا پر اکثر مورخین کا خیال ہے کہ خٹک ابتداء میں غزنی کے

قریب لوگر کی زرخیز وادی میں آباد تھے۔ آج ضلع کرک (جو شوال سے کوچ کے بعد خٹک قبیلے کا مرکزی علاقہ رہا ہے) کا لواغر (جس کا خوشحال خان خٹک نے بھی ذکر کیا ہے) لوگر کے نام پر ہے۔ اور اسی طرح بذاتِ خود کرک بھی وہاں کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ سارے پشتون قبائل افغانستان اور پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے میں مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں پر آباد ہوئے ہیں۔

میرا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ ابتداء میں سارے پشتون قبائل کوچی تھے۔ ان کا گزارہ مال مویشی پر تھا جس کے لیے میدانی علاقوں سے زرخیز پہاڑی علاقے زیادہ موزوں تھے۔ اور اُس زمانے میں مال مویشی کے علاوہ انسانوں کی زیادہ ضروریات بھی انہی پہاڑوں سے پوری ہوتی تھی۔ اور جیسا کہ ابتدائی انسانی زندگی میں تقریباً تمام لوگ ایسی جگہوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کیا کرتے تھے یہی طریقہ پشتونوں کا بھی رہا ہے۔

ہمیں تاریخ کی روشنی میں خٹک قبیلے کی پہلی رہائش کا پتہ وزیرستان کے زرخیز اور خوشگوار آب و ہوا والی وادی شوال میں ملتا ہے۔ اگرچہ تاریخ خٹک کے مصنف جناب عقاب خٹک نے تو یہ لکھا ہے کہ ہزار سال سے بھی پہلے ہم خٹکوں کو کوہ شوال (جو کہ کوہ سلیمان کی شمال مشرقی شاخوں کا نام ہے) کی وادی اور سوترہ کی پہاڑیوں میں (جو کہ کوہ شوال کی شاخیں ہیں) پاتے ہیں۔"

جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس قبیلے کی کچھ آبادی وزیرستان کے کوہ شوال میں اور اُسی زمانے میں کچھ آبادی سوترہ (ضلع کرک) کی پہاڑیوں میں آباد تھی۔ ہم کسی دلیل سے بھی خٹک عقاب کی تردید نہیں کر سکتے۔ عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جس زمانے کی باتیں ہیں قبیلہ خٹک کی روشن تاریخ اس سے بہت بعد میں شروع ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں اختلاف کی بھی گنجائش ہے اور غلطیوں کی بھی۔ لیکن علماء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ امیر تیمور کے زمانے میں قبیلہ خٹک نے جنوبی وزیرستان کی وادی شوال سے ہجرت کی۔ تھوڑے عرصے کے لیے بنوں میں نہر سدرا ونڑ اور اس کے قرب و جوار میں آباد رہے مگر یہ علاقہ اُن کی ضروریات کے لیے کافی نہیں تھا۔ جہاں سے مشرق کی طرف کوچ کر کے سوترہ کی وادی میں آ گئے۔ یہاں وہ تمام ضروریاتِ زندگی

مہیا تھیں جن کی انہیں تلاش تھی۔ اول تو یہ لوگ شوال کی خوشگوار آب و ہوا کے عادی تھے۔ بنوں کی گرم آب و ہوا میں بتا آن کے لیے مشکل تھا۔ وادی سوترہ (ضلع کرک) سطح سمندر سے ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے یہاں کی آب و ہوا شوال کی طرح خوشگوار ہے اور یہ ایک صحت افزا مقام ہے۔ پانی وافر ہے۔ جگہ جگہ پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پہاڑ ہیں جو اس زمانے میں جنگلات سے ڈھکے ہوتے تھے۔ بذاتِ خود یہ وادی بھی بہت زرخیز تھی۔ اور حفاظت کے نکتہ نگاہ سے بھی یہ ایک محفوظ جگہ تھی۔ پہلے پہل بنوں سے خٹک کا سارا قبیلہ اسی وادی میں آ گیا۔ یہی وہ مشہور وادی ہے جس کا ذکر خوشحال خان خٹک کے کلیات میں بار بار آتا ہے۔

چونکہ سارے خٹک ابتدا میں بنوں سے کوچ کے بعد اسی وادی میں آباد ہوئے تھے غالباً اسی بنا پر تاریخ خٹک میں شوال کے ساتھ سوترہ میں قبیلہ خٹک کی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں شاید ہم غلطی پر نہیں ہیں کہ تاریخ خٹک میں شوال اور سوترہ کے ساتھ ساتھ ذکر آنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بیک وقت یہ قبیلہ ان دونوں جگہوں میں آباد تھا۔ یہاں سے اس قبیلے کو چاروں طرف پھیلنے کا موقع ملا۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف سوترہ کے ساتھ واقع درہ چیچلی سے نکل کر موجودہ ضلع میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل میں آباد ہو گئے۔ اور کچھ مشرق میں شکر درہ کی طرف پھیل کر دریائے سندھ کے پار موجودہ ضلع اٹک کے مغربی کنارے تک آباد ہو گئے۔ اوروں نے مغرب میں موجودہ ضلع بنوں کی سرحد سے لگے ہوئے تھل کے میدانی علاقے میں ڈیرے جمائے۔ اور دوسرے شمال اور شمال مغرب کی طرف تیراہ کے کرولن تک جا پہنچے۔ جس کے رستے میں ٹیری۔ کربوغہ۔ گورگری وغیرہ کے مشہور گاؤں آتے ہیں۔ اگرچہ کربوغہ اس رستے سے ذرا ہٹ کر دو آبہ سے متصل علاقہ بنگش کی سرحد کے پاس ہے۔

یہاں پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ چودہویں صدی عیسوی کے آخر میں قبیلہ بنگش بھی وادی کرم سے موجودہ ضلع کوہاٹ کی طرف کوچ کر کے چلا آیا۔ جہاں پر اورکزئی قبیلہ آباد تھا۔ زمین پر قبضہ جمانے کی کوشش میں اورکزئی اور بنگش قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ جنوب سے خٹک بھی اورکزئی علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عزائم کے اشتراک کی بنا پر خٹک اور بنگش نے مل کر اورکزئیوں کے خلاف مہم جاری رکھی۔ اس

عداوت کے دوران دو فیصلہ کن لڑائیاں[1] محمد زئی اور تتی کے قریب ہوئیں۔ جو بالترتیب کوہاٹ سے تقریباً تین اور چار میل کے فاصلہ پر جانب غرب اور جانب جنوب واقع ہیں۔ مورخین نے متفقہ طور پر یہ لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں قبیلہ اورکزئی کو شکست ہوئی اور تیراہ کی پہاڑیوں کی طرف پسپا ہوئے۔ روایات کے مطابق اورکزئیوں کی شکست کی بات صحیح نہیں ہے۔ وہ لڑائیوں کی وجہ سے میدانی علاقہ چھوڑ کر تیراہ کی پہاڑیوں میں پسپا نہیں ہوئے۔ وہ جری، دلیر اور بہادر لوگوں کا قبیلہ ہے۔ ان کی پسپائی کا باعث پشتون ضابطۂ اخلاق کے مطابق اپنے قول کی پاسداری کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔

کہتے ہیں[2] کہ جب بنگش اور اورکزئی قبیلے کے درمیان کافی کشت و خون ہوا تو قبائلی رسم و رواج کے مطابق دونوں قبیلوں کے بزرگوں نے متفقہ طور پر جرگہ منعقد کر کے صلح کرنے کی کوشش کی۔ غالباً تحصیل ہنگو کے گاؤں درسمند کے میدان میں دونوں قبیلوں کا جرگہ اکٹھا ہوا۔ اس زمانے میں پہاڑ کی اہمیت میدان سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان میں سے ایک قبیلہ شمال میں تیراہ کی پہاڑیوں میں آباد ہو جائے، دوسرا میدان میں رہے۔ لیکن فریقین ایک ہی طرف بضد تھے۔ آخر فیصلہ دونوں قبیلوں کے مشترک تائی نامی حجام پر ہوا۔ دونوں اُسے غیر جانبدار سمجھ رہے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ حجام ہوشیار لوگ ہوتے ہیں۔ روزانہ صبح سے لے کر شام تک مختلف قسم کے لوگوں، مختلف طبائع اور نفسیات رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اپنی خوش خلقی کی بنا پر نباہتے ہیں۔ یہ طبقہ زیرک، مردم شناس اور زمانہ شناس ہوتا ہے حجام زمانہ قدیم سے نہایت ہی قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریبات کے انتظام کے علاوہ قبائل میں اعتماد کے بڑے بڑے کام ان کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ یہ بہت پیارے، خوش خلق، خدمت گذار اور فرمانبردار لوگ ہوتے ہیں۔ اسی لیے مقبول خاص و عام ہوتے ہیں۔

تائی حجام کو جب دونوں قبیلوں کے درمیان فیصلہ کرنے کا کام سونپا گیا تو وہ ذہنی طور پر اس

---

[1] خوشحال خان خٹک (اردو)، دوست محمد خان کامل۔ ص ۵

[2] گلشن روہ (قلمی)، مصنفہ سید جعفر حسین شاہ رشتہ نے، پشتو اکیڈیمی لائبریری۔

کے لیے تیار تھا۔ عام لوگ قبائل میں رہتے ہوئے کسی بھی بڑے سے بڑے حکم کے لیے ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ان کے منہ سے کسی بھی حکم کے آگے انکار بعید از قیاس ہے۔ تانی فوراً تیار ہوا لیکن ایک شرط پر کہ کسی تیز ترین گھوڑے پر سوار کر کے اسے زین سے کس کر باندھا جائے تاکہ گھوڑے سے گرنے کا احتمال نہ ہے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ وہ نہایت جوش اور فخر سے گھوڑے پر سوار جرگے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے ہوئے دونوں قبیلوں کے افراد کے منتظر چہروں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور پھر اپنے گھوڑے کو ذرا فاصلے پر کھڑا کر کے ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر نہایت ہی خوش آوازی سے گانے کی صورت میں پکار اٹھا۔

"تانی۔ تانی۔ تانی وا سے وائی
چہ سمہ د بنگشو غرد سے تول د اورکزائی"

(ترجمہ: تانی۔ تانی۔ تانی یہ کہتا ہے کہ میدان بنگشوں کا اور تمام پہاڑ اورکزیوں کا)

یہ کہتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کہاں گیا؟ اس کا پتہ آج تک نہ چل سکا۔

اتفاق سے اُس وقت دونوں قبیلے میدانی علاقے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اورکزیوں کو اس فیصلے سے کافی صدمہ پہنچا۔ مگر قول دے چکے تھے۔ پشتو ضابطۂ اخلاق اور اسلامی تعلیمات دونوں کے ماتحت تانی کے فیصلے پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا اور پھر اورکزئی تیراہ کی پہاڑیوں میں جا بسے جہاں آج تک آباد ہیں۔ بنگش کوہاٹ کے میدانی علاقے پر پھیل کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ اُدھر بنگشوں کے اتحادی ہونے کی وجہ سے خٹک بھی اپنا حصہ لینے کے لیے آگے بڑھے اور کوہاٹ کے کافی علاقے پر قابض ہو گئے۔ نیری سے مشرق کی طرف لاچی سے ہوتے ہوئے سرماری اور گدا خیل گاؤں کی سرحد تک اور پھر دائیں طرف کو جا کر گمبٹ اور خوشحال گڑھ وغیرہ کے علاقے اور نظام پور سے ہوتے ہوئے کوہ چراٹ کے علاقہ خوڑہ تک جا بسے۔ مگر شمال کو خوڑہ سے لے کر جنوب کے موجودہ ضلع میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل تک اور موجودہ ضلع اٹک کے

مغربی حصے سے لے کر مشرق میں ضلع بنوں کی سرحد تک اور شمال مغرب میں رلن سے لے کر جنوب مشرق میں کالا باغ اور مشرق میں موجودہ ضلع اٹک کا مغربی علاقہ ایک اکائی کی صورت میں ان کے ہاتھ آیا۔ اس لمبے فاصلے کے ملک کے درمیان کوئی غیر قبیلہ آباد نہیں تھا جو ملنے جلنے جنگ یا کسی دوسری ضرورت کی بنا پر اکٹھا ہونے کی صورت میں ان کے درمیان حائل ہوتا۔ آج بھی اگرچہ انتظامی لحاظ سے خٹک ضلع میانوالی، ضلع بنوں، ضلع کوہاٹ، ضلع اٹک، ضلع پشاور، ضلع مردان اور ضلع کرک کے سات مختلف اضلاع اور شمال مغربی سرحدی صوبہ اور اور پنجاب کے دو مختلف صوبوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی زمین کی پٹی آپس میں اسی طرح ملی اور جڑی ہوئی ایک خطہ ہے۔ اس سلسلے سے ضلع مردان کے علاقہ بائیزئی کی خٹک آبادی مستثنیٰ ہے جو اس پٹی سے کٹی ہوئی ہے۔

اکوڑخان

قبیلہ خٹک کی خوڑہ تک کی پٹی پر آباد ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ یہ اکوڑ خان کی ہجرت تھی جسے تاریخ میں ملک اکوڑ خان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اکوڑ خان درویش محمد خان عرف چیچو کا بیٹا تھا۔ اس نے کہاں سے ہجرت کی ؟ اس بارے میں مؤرخین اکثر دھوکہ کھا گئے ہیں۔ انہوں نے یہ مقام کربوغہ بتایا ہے۔ اس غلطی کا باعث میرے خیال میں موضع کربوغہ کی وہ شہرت بنی جو کسی زمانے میں سادات کے ایک مشہور گھرانے کے مسکن رہنے کی وجہ سے اُسے نصیب ہوئی۔ یہ گھرانہ حضرت شیخ رحمکار کستیر گل کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیڑی بابا کے آباؤ اجداد کا تھا۔ آستانہ داروں کے اس گھرانے نے جب کربوغہ سے موجودہ زیارت کاکا صاحب کے مقام کو ہجرت کی تو کربوغہ کا نام بھی پشاور تک پہنچا۔ اور بعد میں پشاور کے رہنے والے مؤرخین نے ہر نامی گرامی ہجرت کرنے والے کو کربوغہ سے باندھ دیا۔ بعد میں کربوغہ کی شہرت وہاں کے مشہور ملا صاحب کربوغہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہ دوبارہ ملا صاحب کربوغہ کی وجہ سے نہایت نامی گرامی آستانہ بنا جو اب تک قائم ہے۔

صرف ایک مؤرخ گوپال داس جس نے تاریخ ضلع پشاور لکھی اصل حقیقت تک پہنچ سکا باقی مؤرخین

شاید تاریخ مرصع کے تتبع میں غلطی کر گئے۔ گوپال داس نے تاریخ ضلع پشاور میں لکھا ہے کہ سلطان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے زمانے میں دو حقیقی بھائی ملک اکوڑ و حسن خان پسران چنجو قبیلہ خٹک موضع چونترہ متوطن علاقہ کوہاٹ سے موزہ چراٹ پشاور کی طرف آئے۔

اکوڑخان کا کوچ

تاریخ مرصع میں اکوڑ خان کی ہجرت کی وجہ عزیزوں سے آزردگی اور تاریخ پشاور میں افلاس لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے کوچ کی بات کوئی ایسی تی نہیں جس کے لیے خواہ مخواہ اسباب تلاش کیے جائیں۔ بہتر زندگی کی تلاش میں کوچ کرنا اس زمانے کا عام رواج تھا۔ جیسا بھی تھا جہاں سے ہوتا ہوا بھی وہ چراٹ کے خوزہ تک پہنچا یہ ثابت ہے کہ وہ عنفوان شباب میں اپنے بھائی حسن خان اور دوسرے ہم جو ساتھیوں کے ساتھ یہاں پر آیا۔ جہاں پر پہلے سے بھی خٹک آباد تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اکوڑ خان یہاں پر مستقل بودوباش کی نیت سے نہیں مہم جوئی کی غرض سے آیا تھا۔

تاریخ مرصع کے مطابق یہ وہ زمانہ تھا جب صوبہ کابل کا صوبہ دار اکبر کا سوتیلا بھائی مرزا حکیم تھا اور برصغیر پر اکبر کی حکومت تھی۔ اکبر کی ہندو نوازی اور عقائد کی خرابی مسلمانوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ لوگ اکبر کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی بدظن ہو چکے تھے۔ ملک اکوڑ ایک ایسے علاقے سے آیا تھا جو حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ چراٹ کے خوزہ میں پہنچ کر وہ حلقہ حکومت کے قریب آگیا۔ حکومت کے خلاف جو تاثر تھا اس سے آشنا ہوا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس نے پہلا رد عمل ان ہندو جوگیوں کے قتل کرنے کی صورت میں ظاہر کیا۔ جو چراٹ کی ایک چوٹی کو اپنا مذہبی مقدس مقام مانتے ہوئے زیارت کے لیے آتے تھے اتنے زیادہ جوگیوں کو قتل کیا کہ جب ملاقات کے دوران اکبر نے تعداد کے متعلق ان سے پوچھا تو اکوڑ خان نے جواب دیا کہ تعداد بے شمار ہے البتہ ایک طرح سے حساب لگایا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ان کے کان میں جو بالی ہوتی

لے: تاریخ ضلع پشاور مصنفہ گوپال داس صفحات ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲،

تھی مِیں قتل کرنے کے بعدہ بالی اُتار کر مٹکے میں رکھ دیتا تھا اور اِسی طرح سے دو بڑے مٹکے بھر گئے۔ اکوڑخان پہلے ان جوگیوں کو دعوتِ اسلام دیا کرتا تھا۔ اگر دعوت رد کر دی جاتی تو انہیں قتل کر دیا جاتا۔ ہم اکوڑخان کی اِس حرکت کی تعریف نہیں کر سکتے۔

اکوڑخان اور اس کے ساتھی تاخت و باخت میں مصروف تھے۔ شاہی قافلوں کا رستہ اُن سے محفوظ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اِس تاخت و باخت میں اُس کے ہاتھ سے مغل حاکم پشاور شاہ بیگ خان کا بھائی بھی قتل ہوا۔ جس کا انتقام لینے کے لیے شاہ بیگ خان نے ایک بھاری فوج کے ساتھ خزڑہ کے قبیلہ خٹک پر حملہ کیا۔ دو عظیم لڑائیاں ہوئیں۔ تاریخ مرصع کے مطابق دونوں طرف سے بیشمار لوگ قتل ہوئے۔ شاہ بیگ خان کو شکست ہوئی۔ اکوڑخان کی دھاک حکومت پر بیٹھ گئی۔

اکبر مرزا حکیم کے تعاقب میں اس طرف آیا۔ ابھی اٹک کا قلعہ نہیں بنا تھا۔ نیلاب میں دربار لگایا۔ شاہی سڑک کی حفاظت کی خاطر وادی پشاور کے سرکردہ لوگوں کو طلب کیا۔ ان سے بات ہوئی۔ سب نے وعدہ کیا کہ ہم کابل سے ہندوستان جانے والی سڑک پر کسی قسم کی بدامنی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ بقول مؤرخ تاریخ مرصع عبدالرحمٰن خورزنگ مری خیل اور بعض دوسرے ملکوں نے اکبر سے کہا کہ ہم اپنی طرف سے تو ضمانت دے سکتے ہیں مگر اکوڑ کی ضمانت ہم نہیں دے سکتے۔ اُس سے خود بات کیجئے۔

اکبر کے پاس ملک اکوڑ کی آمد

بادشاہ نے ملک اکوڑ کے پاس ایلچی بھیجا اور اُسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ اکوڑخان مقررہ دن اپنے عزیز و اقارب کو ساتھ لے کر جب خیرآباد کے مقام پر گھوڑوں، علم، ڈھول سُرنا اور بیشمار لوگوں کے جلوس کے ساتھ نمودار ہو کر نہایت ہی شان و شوکت سے دربار کی طرف آ رہا تھا تو بادشاہ نے دریا کے دوسرے کنارے سے یہ جلوس دیکھا کہ یہ شان و شوکت تو بادشاہوں والی ہے۔ لہٰذا دیکھتے ہی اکبر کے دل میں اُس کے لیے عزت

[1] ۔ اس کا تفصیلی ذکر اُس زمانے کے ایک قلمی نسخہ میں موجود ہے جو تحصیل نوشہرہ کے منڈری گاؤں کے ملک عبدالرشید نیاز و انسپکٹر پولیس کے قبضہ میں ہے۔

پیدا ہوئی اور اکوڑ خان کی آؤ بھگت امتیازی حیثیت سے کی گئی۔

اکبر بادشاہ نے شاہی رستے کی ذمہ داری پشاور سے اٹک تک اکوڑ خان کو سونپ دی۔ اور ساتھ ہی خیرآباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ اکوڑ خان کو بطور جاگیر عنایت کیا۔ اکبر نے اٹک کے گھاٹ پر اموال و مواشی کی آمد و رفت پر محصول وصول کرنے کا اختیار بھی اکوڑ خان کو دیا۔ جس کے بعد اکوڑ خان نے خوڑہ سے کوچ کر کے سرائے اکوڑہ آباد کیا جسے آج کل اکوڑہ خٹک کہتے ہیں۔ اور قبیلے کے کچھ لوگ باقی جاگیر پر آباد ہو گئے۔

افضل خان نے تاریخ مرصع میں لکھا ہے کہ اکوڑ خان تلوار کا دھنی، سخی اور بہادر آدمی تھا۔ وہ اپنے بیٹے یوسف خان اور چند دوسرے ساتھیوں سمیت اندرونی اختلافات کی بنا پر تازہ خان بولاک خٹک کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اکوڑ خان کے قتل کے بعد اُس کا بیٹا یحییٰ خان جانشین ہوا۔ وہ بھی چند سال کے بعد اپنے ہی قبیلہ خٹک کے سینی شاخ کے ہاتھوں قتل ہوا۔

یحییٰ خان کے بیٹے شہباز خان نے (جو خوشحال خان خٹک کا باپ تھا) اپنے لیے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔ جب وہ اچھی طرح سے یہ نکتہ سمجھ گیا کہ حکومت کے نمائندوں کے طور پر اپنا آزاد قبیلہ لُٹے اور اُس کے خاندان کو کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہیں اور اُس کا انجام بھی وہی ہو گا جو اس کے باپ دادا کا ہوا تو نہایت ہی ہوشیاری سے قبیلے کی اندرونی رقابتوں کا رُخ ٹپوس کے تبائل کی طرف موڑ دیا۔ جس کے بعد بنگش اور یوسف زئی قبیلے سے لڑائیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو بدبختی کی ایک اور علامت تھی۔ کوئی بھی غیر جانبدار شخص شہباز خان کی اس حکمت عملی کی تائید نہیں کر سکتا۔ کہ ذاتی مفاد کے لیے پشتون قبائل کو آپس میں لڑایا جائے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے وقت کی مناسبت سے جائز سمجھیں مگر میرے خیال میں اس مسئلے کا حل اس سے بہتر صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔

شہباز خان کی اپنی زندگی بھی اپنی لڑائیوں کی نذر ہو گئی اور اس کے جانشین خوشحال خان خٹک کو یہی لڑائیاں ورثے میں ملیں۔

خوشحال خان خٹک کی پیدائش

خوش قسمتی سے خوشحال خان خٹک نے فارسی اور پشتو دونوں زبانوں میں اپنی تاریخ پیدائش خود لکھی ہے۔ فارسی کی تاریخ یہ ہے [1]

تاریخ خوشحال خٹک در ربیع الثانی — آمد چو دریں کہنہ رباط فانی
حق گردانا مردوہ خیر رساں — تاریخش گشت خیر عالم بینی [2]

مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) کے عہد حکومت میں ماہ ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ ہجری (مطابق مئی، جون ۱۶۱۳ء) میں شہباز خان کے ہاں پیدا ہوا۔ اُس کا دوسرا سگا بھائی فقیر جمیل بیگ تھا۔ تیسرا سوتیلا بھائی شمشیر تھا اور چوتھا سوتیلا بھائی میر باز تھا [3]۔ خوشحال [4] خان کو اللہ تعالیٰ نے پچپن نارینہ فرزند دئے تھے۔ ان میں اشرف خان ہجری سب سے بڑا تھا۔ اس کی بیویوں میں ایک ہندوستانی بھی تھی جس سے فرحت خان پیدا ہوا [5]۔

وہ زمانہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نہیں تھا۔ اکثر اُمراء کے بیٹوں کو اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے گھر پر تعلیم دی جاتی تھی۔ یا مسجدوں میں مذہبی تعلیم عام طلبہ کو دی جاتی تھی۔ جس میں اکثر اُمراء کے بیٹے بھی شریک ہوتے تھے۔ اسلامی علوم کے بڑے بڑے مراکز بھی تھے۔ خوشحال خان خٹک کی سلطنت میں اس

---

[1] تاریخ مرصع قلمی نسخہ محمد افضل خان خٹک صفحہ ۲۲۰
[2] عالم بینی: ۱۰۲۲ ہجری۔ تاریخ مرصع حواشی دوست محمد خان کامل مومند صفحہ ۳۰۰
[3] خوشحال خان خٹک (اُردو) دوست محمد خان کامل۔ صفحہ ۲۳
[4] تاریخ مرصع قلمی نسخہ۔ محمد افضل خان خٹک۔ صفحہ ۲۲۲
[5] تاریخ مرصع قلمی نسخہ۔ صفحہ ۲۲۰

بات کا تو کہیں ذکر نہیں کہ اس نے تعلیم کیسے اور کس درسگاہ سے حاصل کی لیکن اُن کی منظوم اور منثور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اُس زمانے کے دستور کے مطابق مکمل تعلیم حاصل کی تھی۔ اس بارے میں وہ خود اوّلیں ملتانی کا ذکر کرتا ہے جو اُس کا استاد تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے ملتان میں بھی تعلیم حاصل کی۔ لیکن دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے اَوّلیں ملتانی صاحب اُن دِنوں پشاور میں درس دیتے رہے ہوں۔ کیونکہ پشاور بھی دینی علوم کی درسگاہوں کا اُس زمانے میں مرکز تھا۔ بانسے کے قریب علم گودر جہانگیر کے زمانے میں بہت بڑا علمی مرکز تھا جس کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ اس لیے آج تک اسے علم گودہ کہا جاتا ہے۔

میر عبدالصمد کے خیال میں خوشحال خان لاہور میں بھی کافی مدت رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں تدریس کے سلسلے میں کچھ وقت گذارا ہو۔[2]

خوشحال خان خٹک سیالکوٹ کے مشہور عالم و مفکر مولانا عبدالحکیم سے بھی بہت زیادہ متاثر تھا۔ مولانا موصوف شاہجہان بادشاہ کے عہد میں شمالی ہندوستان کے سب سے بڑے مفکر اور فلاسفر تھے۔ شاہجہان ان کا اتنا معتقد تھا کہ ایک بار سونے سے اور ایک بار چاندی سے انہیں تلوایا۔ اور انہیں جاگیریں اور متعدد دیہات دئے۔ خوشحال خان خٹک مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہم نشین رہا ہے۔ اُن سے متعدد امور میں تبادلۂ خیال کرتا تھا۔ وہ اس کے آفاقی تصورات سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ چھوٹی بحر کی ایک پشتو غزل میں انہیں اپنا خراجِ عقیدت یوں پیش کیا ہے۔

(ترجمہ: مولانا عبدالحکیم جو دین اور دُنیا کے حکیم ہیں غیر مسلم جوگیوں کی بھی تکریم و تعظیم کرتے تھے۔ کسی نے اُن کی اس روش پر اعتراض کیا تو جواب میں فرمایا کہ صراطِ مستقیم یہی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ حُسنِ سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آیا کرو)۔

خوشحال خان خٹک نے پشتو کی ایک نثری کتاب "دستار نامہ" میں مولانا موصوف کا کئی بار ذکر کیا

---

[1] ایک عالم نے لکھا ہے کہ [illegible] جہانگیر کے زمانے میں [illegible] علماء [illegible] تاریخ [illegible] ترتیب دے۔ انہیں اپنے سفر کے دوران مختلف مقامات پر صرف تین نسخے ملے اور پشاور کے علم گودر کی [illegible] میں [illegible] قلمی نسخے ملے۔

[2] لاہور، خوشحال خان خٹک کا [illegible] (زندہ وقت) انٹرنیشنل، میر عبدالصمد خان (پشتون)

ہے اور اُنہیں عالم العلماء مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام سے پکارا ہے۔ اسی کتاب میں ان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشحال خان امور و مسائل میں اکثر اُن سے تبادلۂ خیال کرتا تھا۔

اُس نے خود تعلیم کے سلسلے میں مدرسہ کا بھی ذکر کیا ہے کہتا ہے کہ سیر و شکار کا شوق اُس کو ایسا دامن گیر تھا کہ اُسے کسب کمال کے لیے مدرسہ چھوڑتا تھا۔ اگر اس کی ایک گھڑی مدرسہ میں صرف ہوتی تو بیس سیر و شکار کی نذر ہو جاتیں۔[1]

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جوانی تک مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ کیونکہ شکار جوانی میں کھیلا جاتا ہے۔ غیر حاضریوں سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے سلسلۂ تعلیم منقطع کیا تھا۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ اُس کا تعلیمی سلسلہ مربوط رہا اور اس کی متعدد تصنیفات و تالیفات اُس کی ذہنی صلاحیتوں کے تنوع کا پتہ دیتی ہیں۔ اور اُس کے ساتھ ہی وہ وسعتِ مطالعہ ظاہر ہوتا ہے جس نے اُسے متعدد مضامین پر حاوی کیا تھا۔ باقی علمی و ادبی کارناموں کو چھوڑ کر اگر صرف اُس کا دیوان یا کلیات ہی پڑھا جائے تو اس سے نہ صرف اُس کے شاعرانہ کمال بلکہ اس کے علم و فضل اور معلومات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اُس کی تصنیفات اور تالیفات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اُس کے شوقِ مطالعہ میں آخری دم تک سارے ناساعد حالات کے باوجود کوئی فرق نہ آیا۔[2]

ایامِ طفولیت اور ابتدائے جوانی کے حادثات

چھ سال کی عمر میں اپنے گھر کے پاس دریائے کابل میں ڈوب گیا۔ بیہوشی کے عالم میں دریا سے باہر نکالا گیا۔ پیٹ پانی سے بھر چکا تھا۔ ناک اور منہ کے ذریعے بہت سا پانی بہنے کے بعد ہوش میں آیا۔

دوسری دفعہ وہ آٹھ سال کا تھا۔ گھر میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ چھپکے ساتھ کھیل رہا تھا۔ چھ

---

[1]۔ خوشحال خان خٹک (اُردو) دوست محمد خان کامل، صفحہ [illegible]۔ کلیات صفحہ [illegible]۔ دیوان حصہ اول صفحہ [illegible]۔

[2]۔ خوشحال خان خٹک (اُردو) دوست محمد خان کامل مومند، صفحہ [illegible]۔ کلیات صفحات [illegible]۔ دیوان حصہ اول صفحہ [illegible]۔

نے اُوپر پھوڑ بچھانے گئے تھے جن پر بھاری پتھر رکھے گئے تھے۔ اچانک تیز آندھی آئی اور چھپر پر بچھا ہوا ایک پھوڑ اُڑا لے گئی۔ ان پر رکھا ہوا ایک پتھر اس تیزی سے خوشحال خان کے ماتھے پر لگا کہ تاریخ مرصع کے مطابق پتھر ٹوٹ گیا
اُس کا ماتھا پھٹ گیا اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ساتویں دن اسے ہوش آیا۔ صحت مند ہوا۔

تیسرا واقعہ [illegible]ھ کا ہے جب اُس کی پہلی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں خوشحال خان شدید میعادی بخار میں مبتلا ہوا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اس پر کسی کر رضائی ڈالنی چاہیئے تاکہ پسینہ آئے۔ رضائی ڈال کر چلد پل کردوں پر عورتیں بیٹھ گئیں۔ اُس کا دم گھٹ گیا۔ قریب المرگ ہوا۔ ہر چند کوشش کی کہ اُس سے رضائی اٹھائی جائے ممکن تھا۔ بیہوش پڑ گیا۔ عورتوں نے شور مچایا اور بین شروع ہوا۔ تھوڑی سی رمق باقی تھی۔ سانس پھر سے شروع ہوا۔
بارہ دن کے بعد پسینہ آیا۔ مکمل طور پر ہوش میں آیا۔ لوگوں کو پہچان لیا۔ اپنی دلہن کو دیکھا جو پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

چوتھا واقعہ ہجرت کا سنہ [illegible]ھ کا ہے۔ پچاس سال عمر تھی۔ منڈ نڑا کا خیل کمال زئی کے ہتیم گاؤں پر حملہ کیا۔ جنگ ہوئی۔ خوشحال خان اور اُس کا گھوڑا بھی زخمی ہوا۔ اسے دو تیر لگے۔ پوری شجاعت سے لڑا اور زخمی حالت میں میدان جنگ سے باہر آیا۔ اللہ تعالیٰ نے موت سے بچا لیا۔ ان کے والد اسی جنگ میں زخمی ہوئے اور بعد میں اسی زخم سے وفات پائی۔

پانچواں واقعہ سنہ ۱۰۶۴ھ (?) تھا۔ خوشحال خان مغل حاکم محمد حسین کے ساتھ ملاقات کی غرض سے کشتی میں بیٹھ کر نماز عصر کے بعد قلعہ اٹک کی طرف روانہ ہوا۔ شام کے وقت اچانک خیرآباد کے سامنے دو بڑے بڑے پتھروں کے درمیان کشتی پھنس گئی اور مکمل طور پر ٹوٹ گئی۔ اس کے تختے بہہ گئے۔ خوشحال خان دو تین ساتھیوں کے ساتھ ایک تختہ پر رہ گیا۔ یہ تختہ پتھر کے کناروں سے اٹک گیا۔ پانی اسے اوپر نیچے چلاتا تھا۔ دریا کا پانی انتہائی ٹھنڈا تھا۔ جو اٹک کی طرف گر گئے وہ بچ گئے۔ جو خیرآباد کی طرف گرے وہ سب ڈوب گئے۔ اندھیری رات میں خوشحال خان اسی حالت میں تختہ کے اُوپر رہا۔ ایک پہر یا اس سے بھی زیادہ وقت کے بعد ایک جالہ آیا جس پر یہ لوگ بیٹھ گئے۔ اٹک کی طرف شبھگی کر نکل گئے۔ خوشحال خان کا باپ، دادا اور پڑدادا سب پچاس پچاس سال کی عمر میں لال کفن پہن کر شہیدوں کی حیثیت سے مدفون ہوئے تھے۔ خوشحال خان کہتا ہے کہ میری عمر بھی اس وقت

پچاس سال کی تھی۔ لہٰذا مجھے یقین ہوا کہ یہ میری شہادت کا وقت ہے۔ مگر موت کو سامنے لاکر خدا نے اپنی قدرت سے بچا لیا۔[1]

چناواقعہ ہے ؁۱۰۷۴ھ میں خوشحال خان کے چچاؤں بہادر خان اور فیروز خان نے مخالفت کی۔ امیر خان کابل کا صوبہ دار تھا۔ اُس کے ساتھ سازش کر رہے تھے۔ اس کا نائب عبدالرحیم تھا جس کی خوشحال خان سے نہیں بنتی تھی۔ اس نے امیر خان کو یہ پٹی پڑھائی کہ آپ کی صوبہ داری کا نقش تب تک نہیں بیٹھ سکتا جب تک خوشحال خان کو قید نہ کیا جائے۔ کچھ مقامی حاسد بھی اس سازش میں شریک ہوئے۔ بادشاہ نے راہداریوں کا باج منع کیا۔ امیر خان کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک سرکردہ آدمی کو قید کروں تو باقی لوگ ڈر کر راہداری سے منع ہو جائیں گے۔ بادشاہ کی طرف روانہ ہوا۔ خوشحال خان بھی اس کے ساتھ چلا۔ بہت سے کام اس کے ابتر تھے۔ جب اٹک کے پار ہوا خوشحال کو واپس کیا اور اس کے چچاؤں کو ساتھ لے گیا۔

امیر خان جب بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے راہداری منع کی ہے؟ اس نے التماس کی کہ راہداری ویسے منع نہیں ہوتی جب تک زبردستی کا عمل نہ کروں۔ بادشاہ نے کہا کہ تم زبردستی کا عمل کیوں نہیں کرتے؟ جواب دیا اس لیے کہ آپ کے عمدہ زمیندار ہیں۔ آپ کے حکم کے بغیر ان پر زبردستی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے بتایا کہ میں نے حکم دیا ہوا ہے۔ جس طرح سے تیرا کام بنے وہی کرو۔ صوبہ دار نے اس طرح مبہم عرض کرکے جواب پا لیا۔ اس کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی اور خوشحال خان کے چچاؤں نے بھی شمشیر خان کی ضمانت پر صوبیدار کو پچاس ہزار روپے دینا قبول کیا۔ خوشحال خان کو قید کرنے کی سازش مکمل ہوئی تھی۔ جونہی پشاور پہنچا اُسے بلا کر قید کیا۔ خوشحال خان کے قید کرنے پر علاقے میں فساد برپا ہوا۔

خوشحال خان نے بادشاہ کو عرضداشت بھیجی۔ بادشاہ نے اُسے اپنے حضور بلایا۔ صوبہ دار بھی پچھتا رہا تھا کہ بُرا کیا کہ بادشاہ کے ایسے خانہ زاد کو بلا سبب قید کیا۔ اگر دربار پہنچا اس کے دوست احباب بھی ہیں پتہ نہیں کیا بنے گا۔

خوشحال خان کو مارنے کی تجویزیں سوچنے لگا۔ ان دنوں الوگے نامی ایک رزڑ قتل ہوا تھا۔ خلیل کے

---

[1] تاریخ مرصع افضل خان خٹک قلمی نسخہ صفحہ ۲۲۴۔

ارباب خدایار نے جو اس سازش میں صوبہ دار کے ساتھ شریک تھا الوگی کے بھائی شہداد کو بلایا تاکہ خوشحال کے خلاف قصاص کا فتویٰ بنایا جا سکے۔ ایک خواجہ صادق بدخشی اس کام پر مامور تھا مگر یہ کام نہ بن سکا۔ آخر خوشحال خان کو بادشاہ کے دربار کے لیے روانہ کیا۔

امیر خان نے خوشحال خان کی برائیوں کی رنگا رنگ تحریریں بادشاہ کے پاس بھیجیں۔ خوشحال خان دارالخلافہ میں کوتوال کی حویلی میں بیٹھا تھا۔ اُسے رہا کیا جانے والا تھا کہ اتنے میں بادشاہ کے پاس امیر خان کی تحریر پہنچی۔ خوشحال خان کو قید کیا گیا۔ ایک سال تک دہلی کے بندیخانہ میں رہا۔ بیمار بھی ہوا۔ تو پرسے غم کے انبار آنے قریب المرگ ہوا۔ مگر اُس کی موت کے لیے یہ وقت نہیں تھا بچ گیا۔

اس کا بڑا بیٹا اشرف خان ہجری مغلوں کی طرف چلا اُسے بھی گرفتار کیا گیا۔ حمزہ خان، الہداد خان وغیرہ یوسفزئی اکثر اکوزئی، بازئی آئے۔ خوشحال خان کی اولاد کو مغلوں سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے علاقے سیکری کا ڈھنگ لے گئے۔ جب بادشاہ نے یہ سنا تو خوشحال خان کو رنتھمبور کے قلعہ میں بند کیا۔ ایک سال وہاں رہا۔ آخر محمد امین خان کی حمایت سے قلعہ رنتھمبور سے رہا ہوا اور دہلی میں نظر بند رکھا گیا۔

خوشحال خان کی غیر حاضری کے دوران علاقہ یوسفزئی میں حکومت کے خلاف مہم شروع ہوئی۔ بادشاہ کو خوشحال خان کی قدر معلوم ہوئی۔ اسے قید کرنے کی سزا میں امیر خان کو قید کیا گیا۔ ہدایت خان صوبہ کابل کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ وہ خوشحال خان کو ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے رخصت کرتے وقت اسے سروپا سے عنایت کی۔ منصب پہلے سے دیا تھا۔ تری اور ربلاک اس کی جاگیر میں دیئے گئے۔ خوشحال خان کے التماس پر پرانی جاگیر اس کے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری کے نام مسلّم رہی۔ غرض یہ کہ یہ ایک بہت بڑا موقع تھا حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کے لیے آسان بنا دیا۔

ساتواں واقعہ۔ ۱۰۵۰ھ میں جب خوشحال خان تازہ تازہ اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا تھا کہ جگت سنگھ نے شاہجہان بادشاہ کے خلاف بغاوت کی۔ خوشحال خان نے سید اصالت بخشی کی وساطت سے اس مہم پر جانے کے لیے بادشاہ سے التماس کی۔ اور پھر اُس کے حکم کے مطابق دو ہزار سوار و پیادہ کو ساتھ لے کر جگت سنگھ کے خلاف

مہم پر روانہ ہوا۔ مرچوں کی لڑائی پہلے ہو چکی تھی۔ جب یہ پہنچا تو اورنگ زیب عالمگیر کے دو مشہور جرنیل بہادر خان اور اصالت خان بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ تاراگڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔ خوشحال خان بھی ان کے ساتھ شامل ہوا۔ تاراگڑھ کی ایک تلہٹی میں تمام لشکر نے مورچے سنبھالے۔ دو تین راتیں گزر گئیں۔ باقی لشکر وہاں سے چلا گیا۔ تنہا خوشحال خان خٹک کو ہزار بندوقچیوں کے ساتھ وہاں پر چھوڑا گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر جگت سنگھ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساز بجا رہا تھا۔ جب عصر کا وقت ہوا تمام راجپوتوں نے اس مورچہ پر حملہ کیا۔ خوشحال خان کا سارا لشکر تتر بتر ہوا۔ اس نے بذاتِ خود بھاگنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ تیس چالیس بہادر حسن خیل دوست اس کے ساتھ رہے۔ جب دشمن کے حملوں کی شدت سے سختی زیادہ بڑھی تو سب ساتھیوں نے مجموعی طور پر ہاتھ بڑھا کر اُسے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ اُس نے سب کو بُرا بھلا کہا کہ یہ کیا نامردی کی باتیں کر رہے ہو۔ سامنے سے تمام ہندوستان کے سورما بہادر خان اور امراء ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ میری پہلی خدمت ہے جس کے لیے مَیں نے خود بادشاہ سے التماس کی تھی۔ اور اب بھاگ جاؤں۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ تم میں سے جو اس کے لیے تیار ہے ٹھہر جائے ورنہ جا سکتے ہو۔ مَیں تو یہیں رہوں گا۔

دوستوں نے جب خوشحال خان کا یہ فیصلہ سنا شام ہو چکی تھی کہ دشمن مور و ملخ کی طرح اس مورچے پر چڑھ آیا۔ خوشحال خان اور اس کے ساتھیوں نے ایک ہی آواز سے تلوار نکالیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ حق تعالیٰ نے کافروں کو شکست دی۔ وہ اور اس کے سب ساتھی سلامت رہے۔ اپنی زندگی میں خوشحال خان سو لڑائیوں میں شریک ہوا تھا مگر جیسی یہ لڑائی تھی ایسی سخت کوئی لڑائی نہیں تھی۔ ایک دو دوسری لڑائیوں میں بہت سختی پیش آئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے آسان کی۔

وہ سخت واقعات جو خوشحال خان کو اپنی زندگی میں پیش آئے مَیں نے من و عن اسی طرح نقل کیے جس طرح سے محمد افضل خان نے تاریخ مرصع میں درج کیے ہیں۔ اُن میں سے ہر واقعہ ایسا تھا جس کے ظاہری خد و خال کے مطابق اُس کے بچ نکلنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ مگر بچ گیا۔ ان کے علاوہ سو لڑائیوں میں شریک ہوا۔ اللہ نے اسے محفوظ رکھا۔ ساری عمر خطرناک مہمات میں مصروف رہا مگر قسمت میں موت لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جن

لوگوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ موت مقررہ وقت پر آتی ہے وہ نہ تو کبھی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ خطرات کا مقابلہ کرتے وقت موت کے خوف سے آنکھیں چراتے ہیں۔ خوشحال خان کا تو اس بارے میں ایک الگ نظریہ بھی تھا جیسا کہ خود ایک شعر میں کہتا ہے ؎

مرگ زما تر فہمہ ښہ تر دا اژوندون دے ۔۔۔ د عزت سرہ چہ نہ وی زیست ژونکار

(ترجمہ: میرے خیال میں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے جس میں انسان عزت سے نہ رہ سکے)

ایک دوسرا شعر اس سے بھی زیادہ شدت کا حامل ہے جس میں وہ کہتا ہے ؎

پہ جہان د ننگیالی دی دا دوہ کارہ ۔۔۔ یا بہ وخوری ګګری یا بہ کامران شی

(ترجمہ: غیرت مند لوگوں کے سامنے صرف دو رستے ہیں یا تو اپنے سر کی بازی لگا کر موت سے ہم آغوش ہوں گے یا کامران ہوں گے)۔

مختصر حالاتِ زندگی

تعلیم و شکار کے ساتھ ساتھ خوشحال خان نے تیرہ سال کی عمر میں عملی طور پر لڑائیوں میں شرکت کرنی شروع کی۔ یہ لڑائیاں پشتونوں کی آپس میں قبائلی لڑائیاں تھیں۔ جن میں خوشحال خان ابتداء ہی سے ایک دلیر اور آزمودہ کار سپاہی کی حیثیت سے شامل رہا۔ قیادت ان لڑائیوں کی اس کا باپ شہباز خان کرتا تھا۔ مگر وہ موقع بھی آیا جب اسے باپ کی زندگی میں آزادانہ طور پر اوائل شباب میں ایک محاذ پر خود ہی قیادت کرنی پڑی۔ یہ سوترہ کی طرف اس کے پہلے سفر کے دوران ہوا۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ سوترہ کی وادی شوال سے ہجرت کے بعد تمام خٹک قبیلے کی پہلی آماجگاہ تھی خوشحال خان کے پردادا اکوڑ خان نے بھی یہیں سے ہجرت کی۔ اکوڑ خان کا تعلق قبیلہ خٹک کے بارک خٹک شاخ سے تھا۔ سوترہ میں آج تک اسی شاخ کے لوگ آباد ہیں۔ جن میں خوشحال خان خٹک کے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کی تعداد زیادہ تھی۔ چونکہ ابھی دنوں اس کے والد شہباز خان کو حکومت کی طرف سے حال تری

برلاک حوالے کیا گیا تھا لہٰذا اسی محال کے انتظام و انصرام کے لیے خوشحال خان کو شہباز خان نے ستره بھیجا تاکہ خاندانی قرابتداری اور عزیزوں کی پشتی بانی سے محال تری برلاک کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے۔ ستره موجودہ ضلع کرک میں واقع ہے۔ وہاں پہنچ کر حسب توقع مقامی لوگوں نے خوشحال خان کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ جس مقصد کے لیے گیا تھا اُس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

اُس زمانے میں ملک مروت[1] کا علاقہ جس پر اب مروت آباد ہیں موجودہ تحصیل عیسیٰ خیل کے سرہنگ نامی قبیلے کے تصرف میں تھا۔ خوشحال خان ستره کے لوگوں کی جمعیت کو ساتھ لے کر اس پر حملہ آور ہوا اور ملک کو فتح کیا۔ اس کے بعد ضلع میانوالی کے موجودہ مرکز عیسیٰ خیل پر حملہ کیا جسے فتح کیا گیا۔ تاریخ مرصع کے مطابق اتنا مال ہاتھ آیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے حساب کے مطابق پانچویں حصے میں جو سردار کو دیا جاتا ہے تین ہزار روپیہ آگیا۔ یہ روپیہ لوگوں کے حساب سے علیحدہ کر کے شہباز خان کے پاس بھیجا۔ تری اور برلاک کے علاقے کا خوشحال خان نے ایسا بندوبست کیا کہ اس کا والد بہت خوش ہوا۔ جس طرح اپنے والد حسن خان کی زندگی میں فرید خان (شیر شاہ سوری) نے سہسرام میں اپنے باپ کی جاگیر کے انتظام میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا بعینہٖ یہی خوشحال خان نے محال تری اور برلاک میں کیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شیر شاہ نے اپنی جاگیر میں ایسی اصلاحات کیں جس پر لوگ اس سے خوش ہوئے۔ خوشحال خان نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو وہ قیادت دی جس پر ان کا اعتماد حاصل ہوا۔ اور اپنی ذات میں بہادری، مروت، زیرکی، ہوشیاری، معاملہ فہمی، عزیزداری کی اُن تمام خوبیوں کو اپنے لوگوں کے سامنے اس طرح سے اُجاگر کیا کہ مدت سے بکھرے ہوئے لوگ ایک لمبے عرصے کے بعد ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔

آغاز اس نے ستره سے کیا تھا بعد میں موجودہ ضلع کوہاٹ اور ضلع کرک میں رہنے والے قبیلہ خٹک کے تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریخ مرصع کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشحال خان نے محال تری اور برلاک کا مرکز ستره کو بنا کر بندوبست کی خاطر وہاں کافی عرصہ گزارا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پہل

---

[1] تاریخ مرصع قلمی نسخہ۔ محمد افضل خان خٹک۔ صفحہ ۲۳۶۔

دفعہ وہاں جاکر وہ کتنا عرصہ رہا۔

شہباز خان کی وفات

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ شہباز خان ایک قبائلی لڑائی میں زخمی ہو کر واپس گھر آیا۔ پانچ دن کے بعد ۱۸ جنوری ۱۶۴۱ء[1] کو فوت ہوا۔

خوشحال خان بحیثیت سردار اور منصب دار

شہباز خان کی موت کے بعد سردار کے انتخاب کا فیصلہ کرنا تھا جو زیادہ مشکل نہ تھا کیونکہ شہباز خان کے چار بیٹوں خوشحال خان، جمیل بیگ، شمشیر خان اور میر باز خان میں خوشحال خان نہ صرف عمر میں سب سے بڑا تھا بلکہ باپ کی زندگی میں اپنی قابلیت، جرأت، شجاعت، معاملہ فہمی، قبیلے کے ساتھ خوشگوار روابط، انتظام و انصرام وغیرہ میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا۔ لہٰذا بغیر کسی پیچیدگی کے اُسے اتفاق رائے سے سردار منتخب کیا گیا۔ اُس وقت خوشحال خان کی عمر قمری حساب سے تقریباً ساڑھے اٹھائیس اور شمسی حساب سے ساڑھے ستائیس سال تھی۔ اُس کا حقیقی چچا بہادر خان بھی اس انتخاب سے متفق تھا۔ اور سارے چچازاد بھائی بھی اُس کے تابع فرمان تھے۔ اُس کے تین چچا فیروز خان، جلال خان اور عبداللہ خان ان دنوں ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر رستے ہی میں شہباز خان کی موت کی خبر پا کر تیزی سے وطن پہنچے۔

خوشحال خان اور پڑوس کے قبائل سے لڑائیاں

پڑوسی قبائل سے لڑائیاں خوشحال خان کو ورثے میں ملی تھیں۔ بدقسمتی سے اس کے باپ کی زندگی ان لڑائیوں کی نذر ہوئی تھی۔ وہ انتقام لینے پر مجبور تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کا باپ ان لڑائیوں کے آغاز اور جاری

---

[1] خوشحال خان خٹک (اُردو) از دوست محمد خان کامل صفحہ ۳

رکھنے میں حق بجانب نہیں تھا۔ مگر ایک طرف سے اپنوں اور غیروں کے سامنے ناک رکھنے اور دوسری طرف اُس زمانے کے مخصوص سیاسی حالات پر خوشحال خان کو یہ لڑائیاں جاری رکھنی پڑیں۔ ایک بہت ہی اچھا شاعر ہونے کے باوجود جنگ و جدل کا غیر شاعرانہ مشغلہ اُسے بہت پسند تھا۔ اُس کا ایک شعر اس بارے میں اس کے مزاج کا ترجمان ہے ؎

دخوشحال ذړه خوشي په هغه وخت وي　　　چه بريښناد سپينو تورو شي و زغرو

(ترجمہ: خوشحال کے دل کو حقیقی خوشی اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب سفید تلوار اور زرہ بکتر چمکتے ہیں) یہ کوئی شاعرانہ تعلی نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر متواتر لڑتا رہا۔ صرف لڑائیوں کی قیادت نہیں کی بلکہ میدان جنگ میں ذاتی طور پر ہمیشہ لڑ لڑ کر داد شجاعت دیتا رہا۔ لڑنا اور مہم جوئی اُسکی فطرت ثانیہ تھی۔ معاملات کو طے کرنے کے سلسلے میں اُس کی یہ حقیقت پسندانہ رائے تھی کہ ؎

یا تکیه دې وي په خداى د وياد توري　　　په جرګو مرکو نه شي کار تمام

(ترجمہ: تکیہ یا تو اللہ کی ذات پر ہونا چاہیئے یا تلوار پر۔ جرگوں مشوروں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا) اپنے والد شہباز خان کے برخلاف خوشحال خان کو حالات اور مجبوریوں نے لڑنے پر آمادہ کیا

پہلے یہ بتایا گیا کہ لڑائی اُسکا مرغوب مشغلہ تھا جو اس حد تک یقیناً درست ہے کہ جب لڑنے کا موقع پیدا ہوتا تو وہ ہرگز اس سے آنکھ چراتا اور نہ جی چراتا۔ مردانہ وار میدان میں کود کر شیروں کی طرح لڑتا۔ مگر یہ ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ وہ لڑنے کے لیے خواہ مخواہ کے مواقع پیدا کرتا یا بغیر کسی وجہ کے لڑتا تھا۔ شومئی قسمت کہ اسکی لڑائیاں پڑوسی قبائل سے شروع ہو کر حکومتِ وقت اور اپنے بچوں تک سے رہیں۔ جن کی تعداد ایک سو بنتی ہے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ وہ قبائل سے شوق پورا کرنے کے لیے لڑ رہا تھا یا حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنا مقصود تھی تو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اتنی طاقتور حکومت سے لڑنا تو تسکین شوق کے لیے نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ بھی شوق کی خاطر تھا تو کیا اپنے جگر گوشوں کے خلاف لڑنا بھی ذاتی غرض یا شوق پورا کرنے کے لیے تھا؟ جس نے ان حالات، واقعات اور خوشحال خان کا اس بارے میں کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہو وہ اس نتیجے پر پہنچے

ہوں گے کہ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر کی طرح امن پسند اور انسان دوست تھا۔ حالات کے تھپیڑوں نے کبھی اُسے سنبھلنے نہیں دیا۔ اس کے سامنے ہمیشہ دو رستے کھلے رہے کہ یا تو بزدلوں کی طرح بہانے تراش کر جنگ سے بچنے کے لیے ذلت اُٹھا کر چین کی زندگی گزارے اور یا نتائج سے بے نیاز ہو کر اللہ کے بھروسے پر اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کے لیے تلوار سنبھالے۔ اُس نے ہمیشہ دوسرے رستے کو اپنایا۔

ہمیں نہ تو اس کے اپنے پڑوسی قبائل سے لڑائیوں میں دلچسپی ہے اور نہ اُنکی تفصیلات میں جانے کی ضرورت۔ انصاف سے کام لے کر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے خلاف لڑنے کی جو مجبوریاں خوشحال کی تھیں وہی مجبوریاں اُن کی بھی تھیں۔ یہ اگر اُن کے خلاف لڑنے میں حق بجانب تھا تو وہ بھی اس کے خلاف لڑنے میں اس سے زیادہ حق بجانب تھے۔ جس کا بعد میں اسے احساس بھی ہوا اور تلافی کی بھی کوشش کی۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر اس کا باپ ان لڑائیوں میں قتل نہ ہوتا تو سرداری سنبھلنے کے فوراً بعد وہ ان لڑائیوں کا اس طرح سے آغاز نہ کرتا۔

مغلوں کی خدمات

قبائلی لڑائیوں کی تفصیلات کو اپنی جگہ چھوڑ کر خوشحال خان کی اُن خدمات کا مختصر طور پر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اُس نے مغلیہ سلطنت کے لیے انجام دیں۔ قبیلے کی طرف سے سردار منتخب ہونے کے تھوڑے عرصے بعد بادشاہ کی طرف سے بھی اُس کی سرداری کی منظوری آگئی۔ اُس کی ابتدائی زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کو خوش کرنے اور حکومت کے ساتھ معاملات خوشگوار استوار رکھنے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور اُس زمانے کے کسی دوسرے سردار اور منصبدار کی طرح وہ بھی بادشاہ کی خوشنودی سے اپنے منصب اور جاگیر میں اضافے کا متمنی رہا۔ وہ مغل اور پشتونوں کے درمیان تعصب اور تفریق سے قطعاً بے نیاز تھا۔ قرآئن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلمان بادشاہ کی خدمت کو کارِ ثواب سمجھتا تھا جس کو بجالانے میں اکثر مواقع پر سر و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔

مہم کانگڑہ و مہم بلخ و بدخشاں

جیسا کہ خوشحال خان کی زندگی کے حادثات کے موضوع میں ذکر کیا گیا ہے کہ راجہ جگت سنگھ کے خلاف بادشاہ کی طرف سے لڑتے ہوئے مہم کانگڑہ میں قلعہ تاراگڑھ کی تسخیر میں جس جرأت و بہادری سے کام لے کر اُس خطرناک مورچے کو فتح کیا، جس میں ہندوستان کی ساری شاہی فوج ناکام ہوئی تھی، اُس کے عوض شاہجہان نے خوش ہو کر لاہور میں اُسے چار لاکھ روپیہ کا نقد انعام اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی جاگیر مرحمت کی۔

اور اسی طرح کی خدمات خوشحال خان خٹک نے شاہجہان کی طرف سے لڑتے ہوئے نذر محمد خان والئی توران کے خلاف کئی بار مہم بلخ و بدخشاں میں سرانجام دی تھیں۔

قید و بند

شاہجہان کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا تو خوشحال خان اُس کا بھی حسب سابق تابع فرمان تھا۔ مگر جب مغل صوبہ دار کابل نے بغیر کسی وجہ کے خوشحال خان کو گرفتار کیا۔ محصول اور راہداری کی معافی کے سلسلے میں صوبہ دار سید امیر خان خوانی نے شہنشاہ عالمگیر سے صوبے کے سرداروں کی گرفتاری کی جو مبہم اجازت لی تھی اُس کا اطلاق خوشحال خان پر ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ محصول کی عام معافی کے اعلان کے بعد اب تک کسی بھی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ خوشحال خان نے کسی طرح کی حکم عدولی کی تھی۔

گرفتاری کے بعد بھی اُسے بادشاہ کی طرف سے حصولِ انصاف کی توقع تھی۔ مگر شاہی دربار میں

لے۔ خوشحال خان خٹک (اُردو) دوست محمد خان کامل (انگریزی ترجمہ حیات افغانی صفحہ ۲۱۱۔ تاریخ خورشید جہان ص۲۴۴ مقدمہ کلیات خوشحال خان ص۳،

بغاوت اسیری پہنچی کہ جب بادشاہ نے خوشحال خان کو رہا کرنے کی بجائے اس کے خاندان اور بچوں کو یرغمال رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور اس موقع پر اسی یوسف زئی قبیلے کے لوگوں نے غیرتِ افغانی کا پاس رکھتے ہوئے اس کے بچوں اور خاندان کی حفاظت کی جن سے وہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہا تو یہی بحثہ اس کے ذہن میں انقلابی تبدیلی کا باعث بنا۔ وہ اس حالہ پہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ باوا اجداد کے زمانے سے لے کر آج تک میں اور میرا خاندان مغلوں کی خدمت کرتا رہا۔ لیکن ایک مغل صوبیدار کے ذاتی عناد کی بنا پر مجھے بغیر کسی جرم کے گرفتار کیا گیا اور بجائے مجھ سے انصاف کرنے کے بادشاہ نے اپنے صوبیدار کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف یوسفزئیوں سے ہمیشہ لڑنے بھڑنے کے باوجود انہوں نے مصیبت کے وقت میرا ساتھ دیا۔ اس کے بعد میں کس منہ سے مغلوں کی خاطر یوسفزئیوں کے خلاف لڑوں گا۔

وطن کو خوشحال خان کی واپسی

پونے پانچ سال کی قید و نظر بندی کے بعد بادشاہ نے خوشحال خان کو اس وقت رہا کیا جب علاقہ یوسف زئی میں مغلیہ حکومت کے خلاف زبردست شورش برپا ہوئی تھی۔ اس موقع پر جب سید امیر خان خوافی کی جگہ مہابت خان کو صوبہ کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تو نئے صوبہ دار نے بادشاہ کے مشورے سے خوشحال خان کو محض اس لیے رہا کیا گیا کہ یوسفزئیوں کی یورش کو روک دیا جا سکتا ہے۔ رہائی کے وقت بادشاہ نے نہ صرف اس کی پرانی جاگیر اور منصب کو بحال رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ وطن واپس پہنچ کر جب علاقہ یوسف زئی میں شگرکوٹ کے مقام پر قلعہ تعمیر کرنے کے لیے خوشحال خان کو اعانت کے لیے کہا گیا تو اس نے یوسفزئیوں کے خلاف لڑنے سے واضح الفاظ میں انکار کیا۔ۓ

خوشحال خان نے پوری نیک نیتی سے حکومت کو یوسفزئیوں سے خواہ مخواہ کی یورش سے منع کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ افغانی طور پر اپنے آپ کو یوسفزئیوں کی حمایت

ۓ خوشحال خان خٹک: اردو، دوست محمد خان کامل مہمند۔ تاریخ مرصع افضل خان۔

کا پابند سمجھ رہا تھا۔ اپنے محسن قبیلے سے حکومت کی یہ زیادتی اس کی غیرت مزید گوارا نہ کر سکی۔[1]

خوشحال خان کے ذہن میں بغاوت کے آثار

صوبہ دار اور خوشحال خان خٹک کے تعلقات کافی کشیدہ ہو چکے تھے کہ اس دوران بادشاہ نے مہابت خان کی جگہ میر جملہ کے بیٹے محمد امین خان کو صوبہ کابل کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جو دوران قید و بند خوشحال خان خٹک کا محسن رہا تھا۔ ایسے موقع پر جبکہ خوشحال خان مغلیہ حکومت سے مزید روابط کے حق میں نہیں تھا ایسے محسن کا صوبہ دار مقرر ہونا اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ وہ کس منہ سے اس آدمی سے آنکھیں پھیر سکتا تھا جس کے احسانات کا بار اس کی گردن پر پڑا ہوا تھا۔

صافی قبیلہ کی لڑکی

انہی دنوں پشتونوں کے صافی قبیلے کے زیر سایہ رہنے والی ایک پراچہ لڑکی کی مغل سپاہیوں نے بے عزتی کی جس کے خلاف ایمل خان مہمند اور دریا خان آفریدی کی قیادت میں پشتونوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کی۔ صوبہ دار محمد امین خان کو خوشحال خٹک نے بنایت نیک نیتی سے پشتونوں کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر محمد امین خان نے اس کی نیت پر شبہ کیا۔ آخر کار پشتون لشکر اور صوبہ دار محمد امین خان کی مغل فوج کے درمیان درہ خیبر میں وہ مشہور لڑائی ہوئی جس میں چالیس پچاس ہزار کی مغل فوج میں سے بہت کم زندہ بچ سکے۔ امین خان کا خزانہ اور حرم تک پشتونوں کے ہاتھ آیا۔ خود صوبہ دار بدترین شکست کھا کر بہت بری حالت میں پشاور پہنچا۔

اس واقعہ کے بعد خوشحال خان اور مغلوں کے درمیان اعتماد مکمل طور پر ختم ہوا۔ بنابریں خوشحال خان نے ایمل خان مہمند اور دریا خان آفریدی کے ساتھ اتحاد کر کے مغلوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔

---

[1] کلیاتِ خوشحال خان خٹک۔ دوست محمد خان کامل۔ ادارہ اشاعت سرحد پشاور۔

مختلف لڑائیاں

خٹک اور آفریدی قبیلے کا لشکر لے کر خوشحال خان نے روزِ روشن میں نوشہرہ کے قلعہ پر حملہ کیا جس میں تین ہزار مغل فوج تھی۔ قلعہ فتح ہوا۔ اور اس طرح سے چھ بڑی بڑی لڑائیوں میں جو خیبر۔ گندب۔ خاپشن، نوشہرہ، ڈوڈہ اور کڑپہ میں ہوئیں پشتونوں نے مغلوں کو بدترین شکست دی۔ ان لڑائیوں میں مغلوں کے بڑے بڑے نامی گرامی جرنیل قتل ہوئے۔ یہاں تک کہ خود شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کو دکن کی مہم ادھوری چھوڑ کر اس طرف آنا پڑا۔ یہاں کے حالات اتنے سنگین تھے کہ شہنشاہ اورنگزیب حسن ابدال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دو سال تک حسن ابدال میں مقیم رہا۔

اس زمانے میں خوشحال خان بھی تمام پشتون قبائل کو مغلوں کے خلاف ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے شب و روز تگ و دو کرتا رہا۔

حالات نے پلٹا کھایا ایک طرف تو خوشحال خان کے بہترین ساتھی ایمل خان مہمند اور دریا خان آفریدی فوت ہوئے اور دوسری طرف مغلوں نے خود خوشحال خان کی اولاد کو اس کے خلاف اُکسایا اب خوشحال خان کی لڑائی کا رخ مغلوں کی بجائے اپنے بیٹوں کی طرف ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس لڑائی میں اس کا اپنا قبیلہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔

مغل اس سارے عرصے میں کوشش کرتے رہے کہ خوشحال خان دوبارہ ان کی جاگیر اور منصب قبول کر کے اُن کا ساتھ دے۔ مگر جب وہ ایک دفعہ بغاوت کر چکا تھا کسی طرح بھی دوبارہ مغلوں سے ملنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔

ایک بات جسے کبھی نہیں بھولنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے سلسلے میں ہر چند اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے کا ثبوت دیا مگر مغلوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد کوئی نرمی نہیں برتی۔ نہ تو بار بار ان کے منصب کی پیش کش اُسے اپنی تحریک سے باز رکھ سکی اور نہ اس کے گھر

میں لگائی ہوئی آگ۔ نہ بڑھاپے نے اس کے ارادوں کو کمزور کیا اور نہ تنہائی نے۔ اُس کا حوصلہ گیارہ سو ہجری (۲۰ فروری ۱۶۸۹عیسوی) کے اُس وقت تک بلند رہا جب انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اس نے داعیٔ اجل کو اٹھتر سال کی عمر میں لبیک کہا۔ اور اپنے ایک شعر میں کہی ہوئی یہ پیش گوئی سچ ثابت کر کے دکھا دی۔ ؎

چہ جامنہ ئے پاتے نہ شی مُردہ شوئیتہ   خدایہ در کرے د خوشحال ہسے رحلت

(ترجمہ: اے خدا خوشحال کو ایسی حالت میں رحلت دے کہ غسّال کے لیے اُس کے تن کا کپڑا بھی باقی نہ رہے)

مختصر تبصرہ

خوشحال خان خٹک اگر نرا شاعر ہوتا تو اُس پر بات کرنے میں اتنی دُشواری پیش نہ آتی. مگر جو شخص بہ یک وقت شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت بہادر سپاہی، تجربہ کار جرنیل فیلسوف، حکیم، ماہرِ فلکیات، ماہرِ انساب، تاریخ دان، سیاستدان، جغرافیہ دان، مُعلمِ اخلاق، شکاری اور اعلیٰ درجے کا شہسوار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو تو اُس پر کچھ کہتے یا لکھتے وقت دُشواری یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں پر ختم کی جائے۔

صرف اُس کی زندگی کی جدوجہد کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسے نصب العین کو سامنے رکھ کر لڑتا رہا جو اپنے زمانے سے بہت پہلے کی بات تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُس نے نہ تو خود کبھی بادشاہ بننے کا سوچا اور نہ کسی دوسرے کو بادشاہ بنانے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ تو پھر وہ کیا مشن تھا جس کے لیے وہ زندگی کے آخر دم تک برسرِ پیکار رہا اُسے ہم صرف ایک شعر سے سمجھ سکتے ہیں۔ جس میں وہ یوں کہتا ہے۔ ؎

اولس چہ سند و بلا لوکا — بادشاہان ورتہ مجبور کاندی اختیار

(ترجمہ: جب عوام متحد ہو جاتے ہیں تو بادشاہ اُن کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔)

اب آپ غور کیجئے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ جب ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ کے براعظموں کے سارے ممالک الگ الگ بادشاہوں کے زیرِ نگیں تھے۔ نہ صرف یہ کہ طاقت کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات کبھی جاتی تھی بلکہ یورپ میں کھلے طور پر انہیں DEVINE RIGHTS OF KINGS

حاصل تھے۔ اور ایشیائی ممالک میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ میں سات ولیوں کی طاقت ہوتی ہے اسی لیے اُن کو ظلِ الٰہی کہا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں یہ سوچنا، کہنا اور اُس کے لیے جدوجہد کرنا کہ ایک ملک کے عوام کے سامنے بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں، اس دعوے کی واضح دلیل ہے کہ خوشحال خان خٹک اپنے زمانے سے یقیناً بہت پہلے پیدا ہُوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں یورپ کی RENAISSANCE تحریک زوروں پر تھی۔ مگر انگلستان میں گلوریس ریوولیوشن ۱۶۸۸ء میں آیا جبکہ خوشحال خان خٹک ۱۶۸۹ء میں فوت بھی ہو چکا تھا۔ گویا آج ہم دنیا میں جس اول درجے کی جمہوریت کی بات کرتے ہیں اگر خوشحال خان اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو جاتا تو لازمی بات ہے کہ اس جمہوریت کے بانیوں میں شمار ہوتا۔ اور اولین جمہوریت کا سہرا انگلستان کی بجائے ہمارے ہی خطے کے سر ہوتا۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ جمہوریت کا تصور ہزاروں سال پرانا ہے اور یونان کے فلیسوف اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن اُن کے سوچنے سے بہت پہلے ہمیں عملی طور پر پشتون قبائل میں ایک ایسی صحت مند اور کامیاب جمہوریت کا نمونہ ملتا ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ رگ وید[1] میں جو پندرہ سو سال قبل از مسیح لکھی گئی ہے اگر ہمیں پشتونوں کا ذکر نظر آتا ہے تو رگ وید کے زمانۂ تحریر سے بہت پہلے بھی وہ یہیں پر آباد تھے۔ اور ان کی قبائلی زندگی کا تانا بانا جمہوری تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب[2] نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ جب سے پشتون ہندوستان میں وارد ہوئے تب سے یہاں پر جمہوری خیالات کی داغ بیل پڑی ہے:

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خوشحال خان خٹک کوئی ایسی نئی بات بھی نہیں کہہ رہا تھا جس کا پہلے وجود نہ تھا۔ اور یہ اُسے اُس معاشرے سے ورثہ میں ملا تھا جس میں اُس نے آنکھیں کھولی تھیں یہ الگ بات ہے کہ اس قبائلی جمہوریت کو وسیع پیمانے پر مشن کی طرح تحریک کی صورت اُس نے دی۔

---

[1] د پشتو ادبیاتو تاریخ از آغا عبدالحئی حبیبی ادارہ اشاعت سرحد پشاور ۱۹۶۵ء
[2] ننگیالے پشتون۔ مقالہ حبیب اللہ تیگے۔ کابل ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۶۶ء

کہنے کو تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خوشحال خان خٹک نے ایک جگہ اپنے کلام میں اپنے ایک ساتھی ایل خان مہمند کی بادشاہی کی تعریف کیوں کی ہے ؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اُس زمانے میں سربراہ حکومت کے لیے صدر کا لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ایل خان مہمند اگرچہ لقب تو بادشاہ کا اختیار کر چکا تھا لیکن تھا وہ قطعی طور پر سربراہِ جمہوریت۔ اُس کا زوال ہوا تو وہ بھی جمہوریت پسندی کی وجہ سے۔ کیونکہ اسکی سلطنت کا کاروبار موجودہ جمہوری روّیے سے سرِ مُو مختلف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دشمنوں نے اُسے زیر کرنا چاہا تو اُس کے قبیلے کے لوگوں سے یہ کہا کہ اگر ایل خان ایک بادشاہ کی طرح صرف اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے در پے نہیں ہے اور عوام دوست ہے تو وہ زمین لوگوں میں تقسیم کر دے۔ ایل خان نے دشمن کی سازش کو بھانپ کر ہر چند کہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ سمجھے۔ چونکہ یہ عوام کا مطالبہ تھا اس لیے جمہوریت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ زمین کی تقسیم پر عوام آپس میں یوں اُلجھ گئے کہ ایل خان کی کمر ٹوٹ گئی۔ یہی مخالفین کی منشا تھی۔

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ خوشحال خان نے یہ شعر کیوں کہا کہ ؎

دبہلول اُو د شیر شاہ خبرے اَورم   چہ پہ ہند کښې پښتانۀ وُو بادشاہان

(ترجمہ: بہلول اور شیر شاہ کی باتیں سُنتا ہوں کہ کبھی یہ پشتون بھی ہندوستان کے بادشاہ تھے)

جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد دہلی میں پشتون بادشاہ محمد غوری نے رکھی۔ پھر اس کے بعد جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی جیسے زبردست پشتون بادشاہ گزرے ہیں اور کئی اس کے بعد بھی۔ لیکن خوشحال خان خٹک نے اُن کی بجائے بہلول کا نام لے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ کا لقب رکھتے ہوئے بھی وہ نہ تو کبھی تخت پر بیٹھا اور نہ ہی تاج زیبِ سر کیا۔ عام لوگوں کے ساتھ فرش پر بیٹھا کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی سردار سے شکایت کرتا تو اپنی پگڑی سر سے اتار کر اُس کے قدموں میں رکھ دیتا کہ یہ میری سرداری کی علامت جو آپ ہی نے میرے سر پر رکھی تھی بڑی خوشی سے واپس لوٹاتا ہوں جسے چاہو اسے پہناؤ۔ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ وہ ہزار

نادم ہو کر پگڑی واپس اُس کے سر پر رکھ دیتا۔

اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو تشریفات کو پسِ پشت ڈال کر بہلول لودھی عیادت کے لیے اس کے گھر پر پہنچ جاتا۔ یہی بات تھی جس کے لیے اُس نے بہلول کی تعریف کی۔

اسی طرح شیر شاہ سوری کے رفاہِ عامہ کے نہ مٹنے والے نقوش آپ کے خیال میں کس بات کی دلیل ہیں؟ رعایا کے لیے یہ سب کچھ ہندوستان کے کسی دوسرے بادشاہ کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اس لیے کہ شیر شاہ سوری ایک جمہوری سربراہ کی طرح اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مثال اُس ہندو سائل کی کہانی ہے جس نے شیر شاہ کے بیٹے کے خلاف یہ شکایت کی کہ اُس نے ہاتھی پر سواری کے وقت میرے گھر میں پھول پھینک کر میری بیوی کی بے عزتی کی ہے شیر شاہ کی جواب طلبی پر اُس کے بیٹے نے ہزار بار کہا کہ اُس کا ارادہ نیک تھا اور یہ پھول صرف اس لیے پھینکا گیا تھا کہ وہ خاتون بیدار ہو کر پردہ کرنے کا سامان کرے تاکہ اُس کے پیچھے آنے والے سوار اُسے نہ دیکھ سکیں۔ لیکن شیر شاہ نے حکم صادر کیا کہ سائل ہندو اُسی طرح ہاتھی پر بیٹھ کر میری بہو پر پھول پھینکے گا تاکہ انصاف کا بول بالا ہو۔ آگے آپ خود اندازہ لگائیں۔

پھر اس بات سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بادشاہ کے نام اور وجود سے جمہوریت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر آج کل کی سب سے بڑی جمہوریت جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے یعنی انگلستان وہ تو اب تک بادشاہ یا ملکہ کے زیرِ سایہ چلتی ہے۔ لہٰذا ان اشعار کے الزام سے خوشحال خان خٹک کو انصاف کی کسی بھی عدالت میں بری کیا جائے گا۔ کیونکہ بات بادشاہ کے نام کی نہیں اُس سلوک کی ہے جس کی بنا پر وہ حکومت کرتا ہے۔ اگر ایک فردِ واحد اپنے آپ کو کروڑوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حقدار سمجھتا ہے اور اپنی ذات اور شخصیت کو ایک دیوتا کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ سلوک کم از کم خوشحال خان خٹک کو کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر رموزِ مملکت کے لیے کہ کیا ساری کائنات کے لیے بندوبست کا طریقہ صرف اور صرف باہمی مشورہ تجویز کرتا ہے اور یہی تعلیم ہمیں مذہب

اسلام نے دی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے سوائے ان معاملات کے جس کا طریقہ کار خود اللہ پاک نے بتایا تھا باقی سب باتوں میں مشاورت کا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے ہمیشہ سب سے پہلے اپنے آپ کو خدائے پاک کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا اور پھر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی روشنی میں عوام کے سامنے۔ خوشحال خان مشورے کی اہمیت جو جمہوریت کی روح ہے۔ یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

نورانی کابندخانے چہ سرہ کینینی　　　دیرینہ ظور یاران پہ مصلحت

(ترجمہ: وہ جگہ جہاں چار پرانے دوست مشورے کے لیے اکٹھے ہو جائیں نورانی ہو جاتی ہے)

گویا باہم مشورہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا خدا کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے۔ اس سے آپ یہ مقصد لیجئے کہ جیسے موجودہ جمہوریت میں عوام مخصوص لوگوں کو اپنی رائے دے کر منتخب کرتے ہیں اور وہ پھر اپنے میں سے معدودے چند افراد کو کابینہ بنانے کا حق دے دیتے ہیں۔ یہی کابینہ مملکت کے کاروبار کے لیے بار بار مل بیٹھ کر مشورہ کرتا ہے کیونکہ ہر وقت کسی کام کے فیصلے کے لیے سب لوگوں کی رائے لینا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ قدیم سے قبائل کا یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ وہاں کسی فیصلے کے لیے کچھ ایسے بزرگ چنے جاتے ہیں جن کی صداقت، دیانتداری، صاف گوئی، امانت داری اور معاملہ فہمی پر سب کو اعتماد ہوتا ہے۔ جب بھی وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو ان کی تعداد کم از کم چار ہوتی ہے۔ اور پشتون جب آپس میں الجھ جاتے ہیں تو ہمیشہ یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ چار پر فیصلہ ہو گا۔ خوشحال خان خٹک کا اشارہ اسی طرف ہے۔ لیکن وہ اس بات کا ہرگز قائل نہیں ہے کہ صرف چند منتخب لوگ جو فیصلہ کرتے ہیں وہ اُس فیصلے سے بہتر ہو گا جو عوام الناس کے مشورے سے ہو۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ صحیح فیصلہ وہی ہو گا جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے مشورے کو دخل ہو۔ اُس کا شعر ہے ؎

بندوبست د کائنات شی پہ خبرو　　　یو تر سلو صدقہ شہ سل تر زرو

(ترجمہ: کائنات کا بندوبست باتوں یعنی مشورے سے ہوتا ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ ایک سو

پر قربان ہو اور سو ہزار پر)

یعنی خوشحال خان یہ کہنا چاہتا ہے کہ مشورہ ہر طرح سے عوامی ہونا چاہیئے یا ہر مشورے کو عوام الناس کی تائید ہونی چاہیئے۔ اپنی نثری کتاب دستار نامہ میں اُس نے بادشاہ یا سردار کیلیے جن بیس ہنروں اور بیس خصلتوں کا ذکر کیا ہے، ان خصائل میں پہلی بات مشاورت رکھی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ رموزِ مملکت کے لیے مشاورت کتنی ضروری سمجھتا ہے۔

اس موضوع پر مزید لکھنے کی بجائے بہتر ہوگا کہ چلتے چلتے اس سوال کا بھی جواب دیا جائے جو بعض لوگ کم علمی کی بنا پر کرتے ہیں کہ خوشحال خان خٹک کی زندگی کی جدوجہد کا مقصد حصولِ منصب تھا۔ یا یہ کہ اگر بادشاہ کی طرف سے اٹک پر وصول کیے جانیوالا وہ محصول جو شہنشاہ اکبر کے زمانے سے خوشحال خان کا خاندان وصول کرتا تھا معاف نہ کیا جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے مختصر الفاظ میں یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک اٹک کے محصول کا تعلق ہے وہ اگرچہ صوبہ کابل کے صوبہ دار سید امیر خان خوافی نے سرحدی علاقوں میں شاہی حکم کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس لیے معاف کیا تھا کہ خوشحال خان ردِعمل کے طور پر حکم عدولی کرے گا اور وہ اسے بہانہ بنا کر اُس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے گا۔ حالانکہ بادشاہ نے محصول کی معافی کا حکم اندرونِ ہند کیا تھا جس کا اطلاق، ظاہر ہے، سرحدی علاقوں پر نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اس حکم کے بعد نہ تو کبھی خوشحال خان نے اٹک کا محصول وصول کیا اور نہ ظاہری ردِعمل کا اظہار کیا۔ نہ ہی اس کا کوئی ثبوت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر صوبیدار خوشحال خان کی جان کا دشمن کیوں بن گیا؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ جاگیر یا منصب اُسے میراث میں ملا تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُس نے شاہی دربار کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رکھنے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ سرحدی قبائل کے وہ رئیس جن کا تعلق مغل دربار سے تھا اپنے اندرونی قبائلی معاملات میں قطعی طور پر آزاد تھے۔ اور جہاں ہر معاملے کا فیصلہ مقامی رسم و رواج یعنی جمہوری طریقے سے ہوا کرتا تھا جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے، لیکن خوشحال خان کو

شاہی عمال کا یہ رویہ کہ وہ سرداروں سے نذرانے وصول کریں یا خوشامد کرائیں، نہ تو کبھی پسند تھا اور نہ اس سے مصالحت کر سکا۔ جب صوبہ دار نے اُس سے پچاس ہزار روپے رشوت کے طور پر مانگے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جیسے کہ وہ کہتا ہے ؎

اَو غوشتہ پنځوس زره روپئی صوبه‌ دار ماوے ورته به ذکرم په قسم هم یو دینار

(ترجمہ: صوبہ دار نے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا اور میں نے جواب دیا کہ میں تجھے ایک دینار بھی نہیں دوں گا)۔

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ خوشحال خان کبھی اُن ہتھکنڈوں میں نہیں اُلجھا جو اکثر شاہی نظام میں استعمال کیے جاتے تھے۔ جب اُسے بے گناہ اور بے قصور گرفتار کیا گیا تب بھی اُس کا خیال تھا کہ یہ باتیں صرف شاہی عمال تک ہیں۔ بادشاہ کی ذات ان سے مبرا ہے۔ اس بنا پر پشاور میں گرفتار ہونے کے بعد اُس نے اپنے بیٹوں اور قبیلے کو پیغام بھیجا کہ جب مجھے قیدی کی حیثیت سے اپنے قبیلے کے رستے سے بادشاہ کے دربار میں لے جایا جائے تو خبردار کوئی مزاحمت نہ کرنا۔ کیونکہ جب میں بادشاہ کے سامنے حقیقتِ حال بیان کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا۔ مگر وہاں جا کر پانچ سال کی قید و نظر بندی کے دوران اُسے جو تلخ تجربہ ہوا اس سے اُس پر آمریت کے اسرار و رموز کھل گئے۔ نہ صرف یہ کہ اُس کی شنوائی تک نہیں ہوئی بلکہ صوبہ دار کی سفارش پر بادشاہ نے اُس کے خاندان کی یرغمالی کا حکم بھی صادر کیا۔ اس موقع پر یوسفزئی قبیلہ کے لوگ آگے بڑھے اور نہ صرف اس کے خاندان کو بلکہ خٹک قبیلے کے سو دوسرے خاندانوں کو بھی نہایت ہی مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پناہ دی۔ جبکہ خوشحال خان ہمیشہ ان سے لڑتا رہا۔ بنیادی نقطہ اُس کے ذہنی انقلاب کا یہی تھا۔ کوئی بھی فیلسوف جب ایک معمے کا سامنا کرتا ہے تو اُس معمے کے حل کی تلاش میں اپنی سوچ فکر اور عقل کے ذریعے وہ جو ارتقائی منازل طے کرتا ہے یہی اُس کا فلسفہ ہوتا ہے۔ اور خوشحال خان کا معمہ اپنے تمام تر خوشگوار تعلقات کے باوجود شاہی دربار کی جانب سے یہ رویہ اور ناخوشگوار تعلقات کے

مقابلے میں یوسفزیوں کا یہ سلوک تھا۔ اسی پر سوچتے سوچتے وہ شخصی حکومت کی تہہ تک پہنچ گیا اور
اسی بنا پر اُسے شدت سے جمہوریت کا احساس ہوا۔ تقریباً پونے پانچ سال کی قید و نظر بندی کے
بعد جب اُسے رہائی بھی دی گئی تو اس توقع کے ساتھ کہ وہ بادشاہ کی طرف سے یوسفزیوں سے لڑے
گا۔ اور یوسفزیوں کے علاقے میں ننگرکوٹ کے مقام پر مغلوں کے قلعے کی تعمیر کرے گا اور یہیں پر منصب دار
کی حیثیت سے کام کرے گا۔ خوشحال خان نے نہ صرف اس منصب کو ٹھکرایا بلکہ یوسفزیوں کے ساتھ
لڑنے سے قطعاً انکار کیا۔ اور جب صوبہ دار مہابت خان نے اُس کے بیٹوں کو اُس کے خلاف اُکسایا تو
بھی وہ خاموش رہا کیونکہ یہ آدمی کبھی اُس کا دوست رہا تھا۔ اور زمانہ قید و بند میں اُس کی مدد بھی کی تھی۔
پھر بھی اس تمام وقت میں وہ خاموش رہتے ہوئے بھی متواتر سوچتا رہا۔ کیونکہ ایک طرف اگر اتنی عظیم
سلطنت کے خلاف ایک فردِ واحد کے لیے کچھ کرنا ممکن نہ تھا تو دوسری طرف کسی ایسے تازیانے کی بھی ضرورت
بھی جو اس کی جدوجہد کے آغاز کے لیے ضروری تھا۔ لہٰذا جب پشتونوں کے صافی قبیلے کے زیر سایہ
رہنے والی خاتون کی مغلوں نے بے حرمتی کی اور صافی قبیلے کے احتجاج کے بعد حکومت کی طرف سے انصاف
کرنے کی بجائے اُلٹا انصاف مانگنے والوں کو سزا دینے کی ٹھانی گئی اور اس کے ردِعمل کے طور پر ایمل خان
مہمند اور دریا خان آفریدی نے تحریک شروع کی تو یہ واقعی ایک بہت بڑا تازیانہ تھا جس پر خوشحال خان کو
بھی اُٹھ کر کھڑے ہونے کی تحریک ملی۔ پھر بھی اتمامِ حجت کے طور پر اُس نے کوشش کی کہ مغلوں کے صوبہ دار
امین خان کو اس پر آمادہ کرے کہ انصاف مانگنے والوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے نہ کہ سزا دینی چاہیئے۔
اس مشورے پر بھی اُس کی سرزنش کی گئی۔ پھر کوئی اُلجھن باقی نہ رہی اور اس مردِ حُر نے فیصلہ کر ہی لیا۔ خوشحال
خان کے پوتے افضل خان نے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے "تاریخ مرصع" میں حکمرانوں کو خوش کرنے کے
لیے واقعات کو توڑ مروڑ کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ افضل خان جو شاہی دربار کا جاگیردار تھا کوشش کرتا
رہا کہ دربار کی خوشنودی کے لیے اپنے دادا کے متعلق بھی وہ کچھ لکھے جس سے خود اس کے متعلق کوئی بدگمانی
پیدا نہ ہو۔ مثلاً وہ یہ لکھتا ہے کہ پشاور شہر کے باہر صوبہ دار امین خان کی خوشحال خان سے تلخ کلامی کے بعد

اُس نے صوبہ دار کو بتایا کہ آپ دیکھ لیں گے کہ مَیں ایمل خان اور دریا خان کے خلاف کس طرح لڑتا ہُوں ۔
اور پھر خیبر کی جنگ میں ہراول کے دستے میں لڑا۔ جبکہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وُہ یُوں کہ خیبر
کی اِس جنگ میں نہ صرف یہ کہ چالیس پچاس ہزار لشکرِ شاہی کاٹ کر رکھ دیا گیا بلکہ سب سے پیچھے آنے
والے امین خان کا حرم بھی گرفتار کیا گیا۔ اور خزانہ لُوٹ لیا گیا۔ صوبہ دار امین خان خود بہت مشکل سے بھاگ نکلنے
میں کامیاب ہوا۔ پھر خوشحال خان ہراول دستے میں لڑتے ہوئے کوئی خراش آئے بغیر کیسے زندہ بچ گیا؟
دوسرا یہ کہ خود افضل خان لکھتا ہے کہ خیبر سے واپسی کے بعد امین خان نے پشاور کے شاہی باغ میں ڈیرہ
جمایا۔ اور خیر خواہ ہمدردی کے لیے اُس کے پاس آتے رہے۔ لیکن خوشحال خان پشاور شہر کو بھی چھوڑ کر
شہر سے جنوب کی طرف ہوتا ہوا سیدھا نوشہرہ پہنچا۔ آخر کیوں ؟ تیسرا یہ کہ اس جنگ کے فوراً بعد اُس
نے شاہی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور نوشہرہ کے قلعہ پر جس میں تین ہزار شاہی فوج تھی،
حملہ کیا اور فتح کیا۔ یہ اعلانِ جنگ خیبر کی جنگ کے فوراً بعد کھلم کھلا طور پر کیوں کیا گیا ؟ چوتھی بات یہ کہ اگر
خوشحال خان اور دریا خان کے خلاف خیبر کی جنگ میں لڑا تھا تو اس کے فوراً بعد اُن کی پارٹی ٹہنگ کیسے
ہوئی ؟ دوستی کیسے بنی ؟ متحدہ محاذ کیوں قائم ہوا اور اعتماد کیسے حاصل ہوا ؟ جو مرتے دم تک قائم رہا ۔
پانچواں یہ کہ اسی تاریخِ مرصع میں افضل خان خود لکھتا ہے کہ اِس جنگ کے دوران خوشحال خان سخت
بیمار تھا۔ چھٹی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوشحال خان نے جس جنگ میں بھی حصہ لیا ہے اُس کا اپنے اشعار
میں ایسا خاکہ کھینچا ہے کہ اپنے ساتھیوں اور اپنے دشمنوں کے ایک ایک وار کا ذکر کیا ہے۔ اور اگر کبھی
شکست بھی ہوئی ہے تو اُسے کبھی نہیں چھپایا۔ خیبر کی اس جنگ میں بھی وہ اپنے ایک قصیدے میں ذکر
کرتا ہے جس میں پہلے صوبہ دار امین خان کے باپ میر جملہ کا نام لے کر اُس کے خاندان کی تباہی پر افسوس
کرتا ہے اور بعد میں نہایت ہی شاندار الفاظ میں ایمل خان اور دریا خان کے لشکر کی فتح پر فخر کرتا ہے۔ اور
اپنی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ جس نے تھوڑا سا بھی خوشحال خان کا مطالعہ کیا ہو وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ
اگر اس بڑی جنگ میں وہ شریک ہوتا تو اس کا ذکر وہ سب سے پہلے کرتا۔ اور یہ کہ اپنے خلاف فتح پر فخر کیسے

کرتا۔ ثابت یہ کرنا ہے کہ اس جنگ کی ابتداء ہی کیا۔ رہائی کے بعد وہ تخت شاہی کی طرف سے کہیں بھی نہیں
لڑا۔ صوبہ دار امین خان کا اعتراض صرف شک کی بنا پر نہیں تھا اُس کے پاس یقیناً یہ ثبوت بھی ہوگا کہ خوشحال
خان ذہنی اور عملی طور پر ایمل خان اور دریا خان کی جمہوری تحریک کا ساتھی ہے۔ خیبر کی جنگ کے بعد آنکے
آپس کے اعتماد سے زیادہ کون سے ثبوت کی ضرورت ہے جو اس بات کی تصدیق کرے اور یہ واضح کرے
کہ صرف ذہنی طور پر نہیں بلکہ خفیہ طور پر ان میں فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا اور افہام و تفہیم کا مشورہ دیتا رہا
تو دوسری طرف اتمامِ حجت کا بھی انتظار کرتا رہا۔

اس کے بعد جب اُس نے تحریک شروع کی تو فتح و کامرانی کے ساتھ ساتھ نہایت تلخ تجربات
ہونے کے باوجود بھی وہ کبھی اپنے مشن سے باز نہیں آیا۔ جیسا کہ خود اُس نے اپنے ایک شعر میں یوں کہا ہے ؎

کہ آسمان دے د زمری پہ خلہ کینبے ورکا

دَ زمری پہ خلہ کینبے مۂ پریږدہ ہمت

(ترجمہ: اگر آسمان تجھے شیر کے منہ میں پھنسائے تو شیر کے منہ میں بھی ہمت کا دامن مت چھوڑو)

اس تمام دوران میں شاہی حکومت بار بار کوشش کرتی رہی کہ خوشحال خان پھر سے منصب
قبول کرے لیکن اُس نے تو یہ کہہ کر پہلے ہی سے فیصلہ کیا تھا ؎

چہ منصب مے دَ مُغل خوړ لیونے وم چہ منصب دَ مُغل نشتہ او س مَلَک یم
دَ شو جو گړے ہسے دا ته شے شرے وایم ناست پہ محلونو دَ آ حک یم

(ترجمہ: جب میں مغلوں کا منصبدار تھا تو میری حیثیت ایک جِک کی تھی۔ اُن کے منصب سے
آزاد ہوا تو میں فرشتہ بن گیا گھاس پھوس کے یہ جھونپڑے میرے لیے اتنے پُرکشش ہیں جیسے میں سفید
چونے کے بنے ہوئے محلات میں بیٹھا ہوں۔)

اندازہ لگائیے کہ خوشحال خان پر اپنی جدوجہد کے دوران منصب کی تہمت لگانے والے
کس حد تک حق بجانب ہیں؟ اگر کوئی خاص تعصب نہ ہو تو پھر ماننا پڑے گا کہ ورثہ میں ملنے والی جاگیرداری

کے فوراً بعد ایک نہایت ہی مضبوط حکومت کے خلاف تحریک نہ چلانا یا قید و بند سے پہلے حکومت وقت سے تعاون کرنا ایک فطری بات تھی۔ کوئی بھی لیڈر پیدا ہوتے ہی اپنا مشن شروع نہیں کرتا۔ حالات و واقعات پیدا ہونے کے بعد کوئی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ محرکات جتنے شدید ہوں اُتنی ہی شدت اُس تحریک میں ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ تحریک شروع کرنے والا آخر دم تک اپنے اصول پر قائم رہا یا انحراف کیا۔ میرے خیال میں اس اصول پر پرکھنے کے بعد خوشحال خان خٹک پر انگلی اُٹھانا یقیناً زیادتی ہو گی۔ اُس کا ایک شعر ہے ؎

چہ جامہ ئے پاتے نہ شی مُوہ شوئی تہ   خدایا ورکرے د خوشحال بے رحلت

(ترجمہ:۔ اے خدا! خوشحال کو ایسی موت دے کہ غسال کے لیے اُس کا کپڑا تک باقی نہ ہے)

ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مشن کی تکمیل کی جدوجہد میں اتنا بڑا سردار، منصبدار، رئیس و جاگیردار جب اپنے گھر گاؤں قبیلے سے باہر آفریدی علاقے میں مرتا ہے تو نہ کوئی آنسو بہانے والی آنکھ ہے اور نہ کوئی ساز و سامان۔ یہ سب کچھ کس بات کی نذر ہو گیا؟ اُن جمہوری اقدار کی بحالی کی جدوجہد کی نذر جن پر بات شروع کی گئی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تلوار اُسے ورثے میں ملی تھی۔ اُس کا باپ، دادا، پردادا سب مردانِ کارزار تھے۔ اور میدان جنگ ہی میں مارے گئے۔ یہی حال اُس کے تمام شجرہ نسب میں چلا آ رہا ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں اُس نے جو تلوار کا دستہ تھاما ہے اٹھہتر سال کی عمر میں صرف موت نے اس پر اُس کی گرفت ڈھیلی کی۔ اُس کی زندگی کے تمام واقعات اس کا بین ثبوت ہیں۔ اگر صرف ایک ہی واقعہ کا ذکر کیا جائے تو بات صاف ہو جائے گی:۔ جب شاہجہان بادشاہ کی افواج نے کانگڑہ کے راجہ جگت سنگھ[1] پر چڑھائی کی تو وہاں تارا گڑھ کا ایک قلعہ ایک ایسی پہاڑی کی چوٹی پر تھا جس پر چاروں طرف کے راستے نہایت دشوار گزار تھے اور قلعہ بھی مضبوط تھا۔ ایک راستہ جس پر چڑھائی کی جا سکتی تھی اُس میں ایک ایسا مورچہ تھا جسے فتح کرنا

---

[1] خوشحال خان خٹک (اردو) دوست محمد خان کامل ص۴۲

بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ بادشاہ کی تمام افواج نے، جس میں اصالت خان اور بہادر خان جیسے بڑے بڑے نامور جرنیل بھی تھے، باری باری اس مورچہ کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جونہی وہ اس کے قریب جاتے تو اوپر سے ایسی آگ برسائی جاتی کہ وہ سب پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ خوشحال خان بھی اپنے دو ہزار لشکر کے ساتھ اس جنگ میں بادشاہ کی طرف سے شامل تھا۔ آخر کار اصالت خان اور بہادر خان[1] نے اُس سے کہا کہ تم بھی قسمت آزمائی کرو۔ جب یہ اپنے ساتھیوں سمیت اس مورچے کی طرف بڑھا تو اُوپر سے وہ آگ برسائی گئی کہ الامان الحفیظ اور جب اس کے ساتھیوں کی ہمت جواب دے گئی۔ تو اس حال میں اس نے مڑکر اپنے ساتھیوں سے یوں خطاب کیا کہ بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ وطن تو یہاں سے بہت دور ہے اور دیکھتے نہیں کہ تمام ہندوستان کی افواج تمہارا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ آج تم کو ثابت کرنا ہے کہ بہادری کیسے ہوتی ہے۔ آگے بڑھو جوانمردوں کی طرح موت سے ہم آغوش ہو جاؤ ورنہ فتح حاصل کرو۔ جیسے کہ وہ کہتا ہے ؎

پہ جہان دَ ننگیالی دی دا دوہ کارہ — یا بہ اُوخوری گُلری یا بہ کامران شی

(ترجمہ: اس جہان میں غیور شخص کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اُس کا سر کٹ جائے گا اور یا کامران ہوگا)۔ یہی تیرا کیونکہ میدان جنگ کے متعلق جہاں اُس نے اور بہت کچھ لکھا ہے وہاں صرف ایک نتیجے پر پہنچا ہے۔ وہ یہ کہ ؎

کَ دَ جنگ پہ کار کښے ډیرې حکمتونہ — چہ پہ سر صرفہ او نہ کړے ہنر دا دے

(ترجمہ: جنگ لڑنے کی جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں وہاں جنگ جیتنے کا واحد ہُنر یہ ہے کہ سر کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑا جائے)۔ قدیم سپارٹا والے تھے یا جاپانی، کل کے ترک تھے یا آج کے ویٹ نامی۔ سب نے اپنی بہادری کی دھاک اسی ہُنر سے بٹھائی ہے۔ اور جب اس ہُنر کو کام میں لایا گیا اور خوشحال خان کا لشکر اس کی قیادت میں آگے بڑھا تو دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مورچہ فتح ہوا اور افواج ہندوستان تماشا دیکھتی

---

[1] یہ داؤد زئی افغان تھا۔ جلال خان دلیر خان، جس جبر عالمگیری میں شیرا جی کو اطاعت پر مجبور کیا تھا، کا بڑا بھائی تھا۔ باپ کا نام بہار خان مد بیٹھا۔ (خوشحال خان خٹک۔ اُردو۔ دوست محمد خان کامل ص ۲۶۶)۔

ہوئی انگشت بدنداں رہ گئیں۔ اس فتح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ شاہجہان نے اس پر
نہ صرف اُسے چار لاکھ روپے کا انعام دیا بلکہ جاگیر میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔

اس مردِ آہن کی ساری زندگی ایسے ہی معرکوں سے عبارت ہے۔ حتیٰ کہ جب اُس کا بیٹا نظام خان چھبیس سال کا جوانِ رعنا مرتا ہے تو کون باپ ہوگا جس کو ایسے سانحے پر دکھ نہ ہو۔ خوشحال خان بھی بہت زیادہ دُکھی ہے لیکن کیوں ؟ اس لیے کہ نظام خان کو بستر پر پڑے ہوئے موت آئی ہے۔ اور باپ کی خواہش کے قطعاً برعکس۔ کیونکہ وہ تو چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا ایک شمالی پشتون کی طرح میدانِ کارزار میں لڑتے ہوئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے موت سے ہم کنار ہوتا۔ اس لیے کہ جو بیٹا قومی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے مر جائے وہ دنیا میں باپ کی گردن اُونچی کر لیتا ہے۔ اس موقع پر خوشحال خان کہتا ہے ؎

کاشکے چہ خوان ورپښتانہ پہ ننگ کښے مړ شے
نہ چہ مرګ د ده ور د روے لہ تو سکہ
چہ د قام پہ ننگ کښے و مرہ ښه زوے
پہ عالم کښے دا با غا رہ کړکہ

(ترجمہ: کاش تُو ایک پشتون کی طرح میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جوان مر جاتا۔ جو جوان قومی عزت و ناموس کے تحفظ کی خاطر لڑتے ہوئے مر جائے وہ دُنیا میں باپ کی گردن اُونچی کر لیتا ہے)۔

ایک جگہ فرماتا ہیں ؎

دزمریو دمرہ نتوب پہ لشکر نہ دی   ستہ ہر کوریائے پہ خپل ځان شی

(ترجمہ: شیر اس لیے بہادر نہیں ہوتے کہ اُن کے پاس لشکر ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے زورِ بازو پر بھروسہ رکھتے ہیں)۔

اور اس کا عملی نمونہ یوں پیش کرتا ہے کہ خوشحال خان بے یار و مددگار اپنے گھر گاؤں کو خیرباد کہتے ہوئے نظام پور کے مقام پر تن تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ حکومت کا حکم ہے کہ اسے بہرحال گرفتار کر کے لانا

ہے۔ اپنے ہی بیٹے حکومت کی طرف سے اُس کی گرفتاری کی سرتوڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ اُس وقت اُس کی عمر چہتر چہتر سال ہے۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ چاروں طرف سے دشمن نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ دشمن قریب سے قریب آ رہا ہے۔ مگر خوشحال خان کی گرفت حسبِ معمول تلوار پر سخت ہے۔ شیر کی طرح چنگھاڑتے ہوئے آواز دیتا ہے کہ آؤ آگے بڑھو۔ جس کی ہمت ہو میرے سامنے آئے۔ میرے ساتھ بازو آزما کر تماشا دیکھے۔ مخالفین کے لاؤ لشکر میں کسی بھی ہمت نہیں۔ کوئی بھی قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کون اپنے سر سے گزرے؟ کون جان سے ہاتھ دھوئے؟ وہ جانتے ہیں کہ مدِمقابل کون ہے ؎

لا یہ خوب کنبے یہ لرزہ پر یوزی لاکتہ چہ دُ چا تر غوږ زما دتورے شرنګ شی

(ترجمہ: جو ایک دفعہ میری تلوار کی جھنکار سُن لے وہ سوتے میں بھی لرزہ براندام چارپائی سے گر پڑتا ہے)

اتنے میں نماز کا وقت آتا ہے تو یہ مردِ مومن چیخ کر کہتا ہے کہ تم سے میں کوئی درخواست نہیں کرتا۔ تم آگے بڑھ نہیں سکتے اور ادھر نماز کا وقت جا رہا ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں صرف اتنی مہربانی کرنا کہ نماز پڑھتے ہوئے مجھے دھوکہ نہ دینا۔ نماز سے فارغ ہونے تک انتظار کرنا۔ اور پھر جو جی میں آئے کر گزرنا۔ نتیجہ یہ کہ دشمن اس بے سروسامانی کے باوجود اُسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ خوشحال خان کو معلوم ہے کہ رہتی دُنیا تک صرف اُن لوگوں کو یاد کیا جاتا ہے جو بہادر ہوں۔

؎ بیرتی دی چہ یادیږی پہ سندر وہم پہ ویر

(ترجمہ: ماتم اور گیتوں دونوں میں صرف بہادروں کو یاد کیا جاتا ہے)۔

اَب ذرا تلوار کا ذکر چھوڑ کر ہم قلم کی بات کرتے ہیں۔ ایک جگہ پر اُس نے دعویٰ کیا ہے

؎ کہ نظم کہ د نثر کہ د خط دے پہ پښتو ژبہ ے حق دے بعلابہ

(ترجمہ: میرا پشتو زبان پر بہت بڑا احسان ہے چاہے وہ نظم ہو۔ نثر ہو یا رسم الخط)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوشحال خان سے پہلے پشتو زبان کی حیثیت ایک منہ زور گھوڑے کی تھی جسے لگام دینا یا اس پر سواری کرنا ممکن نہ تھا۔ کئی لوگوں نے کوشش ضرور کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن بات نہ بنی۔ امیر کروڑ سے لے کر بیٹ بابا، اسماعیل غرشین، اکبر زمینداوری، سلیمان ماکو، بایزید انصاری اخون درویزہ، مرزا خان انصاری، دولت اللہ لوہانی، ارزانی، واصل وغیرہ سب نے نظم و نثر میں طبع آزمائی کی لیکن زبان کی بات وہیں پر رہی۔ اُس زمانے کی ترقی یافتہ زبانوں مثلاً عربی، فارسی کے مقابلے میں خوشحال خان سے پہلے کا ادب رکھنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جب خوشحال خان نے قلم اٹھایا تو اس شہ زور گھوڑے کو وہ شہسوار مل گیا جس کا انتظار تھا۔ ایک طرف سے اُسے لگام دیا اور دوسری طرف سے ایڑ لگائی اور پھر یہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

خوشحال خان کا فارسی کلام اس بات کا گواہ ہے کہ وہ نہ صرف اس زمانے کے باقی علماء اور شعراء کی طرح اس زبان کا عالم تھا بلکہ اس میں بخوبی اظہارِ خیال بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے دیدہ و دانستہ پشتو کا انتخاب کیا۔

ے   پہ فارسی ژبہ ہم قلم گویا دے   بائے شؤ کرم ہر څو کہ خپل لری بنا غلی

(ترجمہ: میرا قلم فارسی بھی لکھ سکتا ہے لیکن اپنوں کی بات ہی کچھ اور ہے)۔

اُس نے پشتو کا انتخاب صرف مادری زبان ہونے کی وجہ سے نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن خیالات کا اظہار وہ کرنا چاہتا تھا اور جو پیغام وہ دینا چاہتا تھا اُس کے لیے مزاج کے لحاظ سے صرف اور صرف پشتو ہی موزوں تھی۔ زبان کو اُس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس سے پہلے جو نثر لکھی گئی تھی اُس کے مقابلے میں جس نثر کی بنیاد خوشحال خان نے رکھی وہ انتہائی ترقی یافتہ نثر تھی۔ دستارنامے کی نثر اس دعوے کا ثبوت ہے۔ اُس کے بعد سے اسی نثر کو بنیاد بنا کر نثر نگاری کی جاتی رہی۔ رسم الخط کی تو بات ہی کیا ہے۔ خوشحال خان نے اپنے زمانے میں پشتو شارٹ ہینڈ کا بھی زنخیزی کے نام سے ایجاد کیا جب ہم اس کی نظم کی بات کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دنیا کھل جاتی ہے۔ حیرت زدہ ہو کر

یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ اُس نے کیا کہیں اور کیا چھوڑیں۔ اُس نے نظم کو ہاتھ لگا کر پشتو نظم کی تو کیا پشتو زبان کی دُنیا بدل دی۔ وہ کون سا صنفِ سُخن ہے جس میں اُس نے طبع آزمائی نہیں کی؟ زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے جس کو اس نے موضوعِ بحث نہیں بنایا؟ کون سا وُہ صحت مند پیغام ہے جو اُس نے اپنی شاعری میں نہیں دیا؟

غزل، قصیدہ، رباعی، ترجیع بند، مثلث، مخمس، غرضیکہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اس سے پہلے جتنی بھی اصنافِ سُخن تھیں اُن سب میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ بیک جنبشِ قلم پشتو نظم کو ان کے مقابلے میں یُوں لا کھڑا کیا کہ رہتی دُنیا تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس زبان میں بنایت ترقی یافتہ ادب موجود نہیں ہے۔ رومانی، اخلاقی، اجتماعی، وطنی، ملی، مذہبی، فلسفیانہ، صوفیانہ، رزمی، حماسی، فکاہی اور باقی ہزار قسم کے مطالب کو شعر کا جامہ پہنایا۔ ہر ذوق کی بات سادہ اور سلیس پیرائے میں کی۔ اور اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا کہ ؎

ما خوشحال چہ پہ پشتو علم بلند کړو　　　ذخبرو ملک مے فتح پہ سمند کړو

(ترجمہ: مجھ خوشحال نے پشتو میں جب علم بلند کیا تو اپنے سمند سے جہانِ سُخن کو فتح کیا۔)

مرد کے لیے اُسے جو کچھ پسند ہے اُس سے آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے۔

؎

مرو هغہ چہ ہمت ناک برکت ناک　　　ذعالم سره خو د پہ زیست او ښرواک

مخ ئے سُخ، قول ئے قول، عہد ئے عہد　　　نہ ئے دروغ شئے فریب نہ تش تپاک

بز ویل زړئے کول پہ خاموشئ کښے　　　ذ نفچے غوند خلق پرے سینہ چاک

چہ خبره د پستئ د بلندئ شی　　　پہ لوئی تکہ آسمان پہ پستئ خاک

چہ دا ہسے بشړ ویل کا نہ پوہیږم　　　چہ خوشحال را ورلہ کوم دا او راک

(ترجمہ: مرد وہ ہے جو ہمت والا ہو۔ برکت والا ہو۔ لوگوں کے ساتھ زیست روزگار میں پیار سے ملتا ہو۔ اُس کا چہرہ روشن ہو۔ قول اور عہد کا پکا ہو۔ نہ فریبی ہو اور نہ زبانی دعوے کرتا ہو۔ باتیں کم اور

عمل زیادہ کرتا ہو۔ غنچے کی طرح اُس کا منہ بند اور سینہ چاک ہو۔ جب پستی اور بلندی کی بات آجائے تو وہ بلندی میں آسمان اور تواضع میں خاک بن جائے۔ یہ جو ایسی اچھی باتیں کہتا ہے معلوم نہیں کہ خوشحال کو یہ ادراک کہاں سے ملا!)

خوشحال کے بارے میں جوں جوں تحقیقات ہوتی جاتی ہے ہم ایسی اُونچی صفات اور انسانی فضائل کے ساتھ واقف ہوتے جاتے ہیں جن سے خوشحال کے کلام اور شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے وہ ہمیں بتاتا ہے ۔

چہ دستار تړی هزاردی   د دستار سړی په شمار دی

(ترجمہ: ویسے تو ہزاروں لوگ دستار باندھتے ہیں لیکن دستار کی اہلیت صرف چند ایک میں ہوتی ہے)۔

اور اُس نے خود اپنی نثر کی کتاب دستار نامہ میں بتایا ہے کہ دستار باندھنے والے کسی سردار یا مملکت کے سربراہ کے لیے مندرجہ ذیل بیس ہُنر اور بیس خصائل کا حتمی طور پر حامل ہونا چاہیئے۔

ہُنر:- (۱) خود شناسی۔ (۲) علم اور کمال کا حصول۔ (۳) خط کا ہُنر۔ (۴) شعر کا ہُنر۔ (۵) تیر اندازی کا ہُنر۔ (۶) داؤ بازی کا ہُنر۔ (۷) شہسواری کا ہُنر۔ (۸) شکار کا ہُنر۔ (۹) شجاعت کا ہُنر۔ (۱۰) اخلاق کا ہُنر۔ (۱۱) ازدواج اور معاشرت کا ہُنر۔ (۱۲) اولاد کی تربیت۔ (۱۳) خدمتگاروں اور لشکر کی تادیب کا ہُنر۔ (۱۴) معیشت کو سنوارنے کا ہُنر۔ (۱۵) زراعت اور دہقانی کا ہُنر۔ (۱۶) تجارت کا ہُنر۔ (۱۷) تحقیق نسب کا ہُنر۔ (۱۸) موسیقی کا ہُنر۔ (۱۹) نرد اور شطرنج کا ہُنر۔ (۲۰) نقاشی اور مصوری کا ہُنر۔

خصائل:- (۱) مشاورت۔ (۲) عزیمت۔ (۳) خاموشی۔ (۴) راستی۔ (۵) شرم و حیا۔ (۶) نیک خوئی۔ (۷) مروّت۔ (۸) عفو و کرم۔ (۹) تمیز۔ (۱۰) عدل و انصاف۔ (۱۱) توکل۔ (۱۲) پرورش اور دلربا کا استعمال حسب حال۔ (۱۳) خوف و رجا۔ (۱۴) مملکت کا انتظام۔ (۱۵) ہمت۔ (۱۶) حلم۔ (۱۷) غیرت۔ (۱۸) احترام اور احتیاط۔ (۱۹) طاعت و تقویٰ۔ (۲۰) استغفار۔

خوشحال خان خود بھی نہایت متوکل انسان تھا اور دوسروں کو بھی یہی درس دیتا رہا۔ وہ اس عقیدے میں یقین ہی نہیں رکھتا کہ اگر چہ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔ اُس کا عندیہ تو بس یہی ہے کہ ؎ زمانہ با تو نہ سازد۔ تو با زمانہ ستیزہ۔ اور کہتا ہے

؎ توکلت علی اللہ وینا یوہ
دَخوشحال وزمانے سرہ سازنشتہ

(ترجمہ: توکلت علی اللہ۔ بات ایک ہی ہے کہ خوشحال کی زمانے کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی)۔

جب فلسفے میں جاتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے: "علم کی انتہا حیرت ہے۔ مشہور بات ہے کہ سقراط سے کسی نے پوچھا کہ آپ اس دُنیا میں کیا سمجھے؟ جواب تھا کچھ نہیں: پھر سوال ہوا کہ اس طرح سے تو آپ میں اور ایک جاہل میں کوئی فرق نہیں۔ سقراط نے جواب دیا کہ فرق یہ ہے کہ اُسے اپنی لاعلمی کا احساس نہیں اور مجھے ہے:" خوشحال خان کہتا ہے ؎

ما چہ نظر او کړو پہ ذرات پہ موجودات
ګول پچیان راغلم ترے بہ ګول درودم صیات
یو څادر ترمیان دی فہم پلتے شی لہ کار
دا حصرہ قصے ھمرہ وادراک د سماوات

(ترجمہ: جب مَیں نے ذرات اور موجودات پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ مَیں اس دُنیا میں لاعلم آیا اور لاعلم مروں گا۔ حد یہ ہے کہ جہاں ایک چادر بیچ میں حائل ہو تو وہاں عقل و فہم اندازہ لگانے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ پھر بھی ہم اتنی باتیں کرتے ہیں اور آسمانوں کے ادراک کے درپے ہیں)۔

لیکن ساتھ ہی وہ اُس زمانے میں جبکہ زمین پر صرف بیل گاڑیاں چلتی تھیں، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صرف ہُنر کی کمی ہے ورنہ آسمان پر چڑھا جا سکتا ہے۔ اور مَیں تمہیں ہُنر کے ذریعے وہ رستہ بتا سکتا ہوں ؎

وائے لار دختو نشتہ د آسمان تہ
زۂ بہ لار درتہ پیدا کرم بے ہُنرہ

(ترجمہ: تم کہتے ہو کہ آسمان پر پہنچ جانے کا کوئی رستہ نہیں۔ اے بے ہُنر! میں رستہ ڈھونڈ کر بتا سکتا ہوں)

اور آگے جا کر کہتا ہے ؎

جہانونہ ڈیر دی تۂ ئے نۂ وینے ناوانہ
گورہ ځو دی ہسے زمکے گورہ څو ہسے آسمانہ
آئینۂ دزرۂ صیقل کرہ چہ لو وینے لے جانہ
کۂ دا ننداره اوشی جدا نۂ ئے لۂ سبحانہ

(ترجمہ: جہان بہت زیادہ ہیں۔ تو اپنی نادانی کی وجہ سے انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی اور کئی زمینیں اور کئی آسمان ہیں۔ اے عرش سے عظیم انسان! سب تیرے دل میں سموئے ہوئے ہیں۔ اپنے دل کا آئینہ صاف کرو۔ میری جان! تب اسے دیکھ سکو گے۔ اگر یہ تماشا دیکھ سکا پھر تو اللہ سے الگ نہیں۔)

اُسے یہ شدید احساس ہے کہ انسان کو اللہ پاک نے زمین پر مُفت میں اپنا خلیفہ بنا کر نہیں بھیجا۔ اس میں بے انتہا صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنی ہی صلاحیتوں کا کھوج نہیں لگا سکتا۔ فرماتا ہے ؎

ماہیت ئے موندہ نۂ شی — چہ څۂ څیز دے دا بشر
لکہ دۂ دے پہ جہان کښے — بل بہ نۂ وی دیدہ ور
ڈیر خوبز تر خدائے راکوزدے — کۂ ئے نۂ دے برابر

(ترجمہ: یہ بشر بھی عجیب چیز ہے جس کی ماہیت کا اندازہ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ دُنیا میں اس کے مقابلے کا اور کوئی دیدہ ور ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ یہ خدا تو نہیں لیکن خدا سے بس ذرا نیچے ہے)۔

لیکن یہی بشر جب نامرد ہو جاتا ہے تو خوشحال اُس سے اس حد تک بیزاری کا اظہار کرتا

ہے ؎

ځ مرد سره ملے تہ رسیدے   نہ د مرد سره پہ بیدی بیدیا د رک

(ترجمہ: مَیں مرد کے ساتھ صحراؤں میں گم ہو جانے کو نامرد کے ساتھ تخت پہنچنے پر ترجیح

دیتا ہوں)۔

پس لہ مرګہ شخ د مرد تر قدم بنہ یم   ګورے مرشہ د نامرد لہ ګورہ سم

(ترجمہ: موت کے بعد مَیں مرد کے قدموں میں دفنائے جانے کو ترجیح دوں گا۔ خدا نہ

کرے کہ میری قبر نامرد کے ساتھ بنے)۔

مرد ہونے کے لیے تو ایک معیار ہے۔ خوشحال خان کی زبانی سنئے ؎

مرد بہ نہ شی پہ ګفتار   څو پیدا نہ کړی کردار

چہ غیرت دِ ور سرہ نہ وی   بیخہ مرد نہ دے پکار

چہ مُہرہ لری ہم زهر   بنہ مردان دی لکہ مار

چہ ہم تند۔ ہم باران وی   لہ ہغو مردانو ځار

مرد بہ غم د خپل ہنر کا   نہ د زر نہ د دینار

نامرد فخر پہ نسب کا   مرد نہ مور لری نہ پلار

(ترجمہ: گفتار سے کوئی مرد نہیں بنتا جب تک کردار پیدا نہ کرے۔ جس میں غیرت نہ ہو

اُس مرد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھے مرد تو سانپ کی طرح ہوتے ہیں۔ زہر بھی رکھتے ہیں اور زہر مہرہ

بھی۔ مَیں اُن مردوں کے قربان جاؤں جو آسمانی بجلی بھی ہوں اور بارش بھی۔ مرد کو تو بس اپنے ہنر کی

فکر ہوتی ہے زر اور دینار کی نہیں۔ نامرد نسب پر فخر کرتا ہے۔ مرد کی نہ ماں ہوتی ہے اور نہ باپ)۔

آزادی تر باچاہیہ لا تیرے کا   چہ د بل تر حکم لاندے شی زندان شی

آزادی کا درس یوں دیتا ہے ؎

(ترجمہ: آزادی تو سلطنت سے اُونچی چیز ہے۔ جو دوسرے کے حکم کا ماتحت ہو وہ تو زندان
میں رہتا ہے)۔

اور نوکری کے متعلق کہتا ہے ؎

نوکر ژوندے نہ دی حال ئے د مړو دی خپل زړۂ ئے نہ دی د صاحب پہ زړۂ دی

(ترجمہ: نوکر زندہ نہیں مردے کی مانند ہوتا ہے۔ اپنا گویا دل ہی نہیں رکھتا بس صاحب
کی مرضی پر چلتا ہے)۔

چہ ورتہ حکم د خپل صاحب وی کہ ہر څو گران وی ہم ئے پہ زړۂ دی

(ترجمہ: صاحب جو حکم بھی دے وہ چاہے کتنا مشکل کیوں نہ ہو یہ تعمیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے)۔
دشمن کے سامنے اگر کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ چاہے تیرے دل پر غم و اندوہ کے کالے
بادل چھائے ہوئے ہوں پھر بھی اُس کے سامنے ہنسا کرو۔ خوشی کا اظہار کرو۔ مسرور ہونے کا تاثر دو
اور اگر زیادہ پریشانی سے تیرا چہرہ زرد پڑ چکا ہے تو اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑ لگا کر اُسے
سرخ کرو۔ تاکہ دشمن اُسے زرد نہ دیکھ سکے۔

غم د غلیم تہ لہ دلہ دُور کړه خندا ہوس کړه شادی سرور کړه

کہ مخ دے زیړ دی پہ دلگیری کښے تنے پہ دواړو څپیړ و سُور کړه

(ترجمہ: دشمن کے سامنے اپنے دل سے غم دُور رکھو۔ اُس کے سامنے ہنسو، خوشی اور سرور کا
مظاہرہ کرو۔ اگر پریشانی سے تیرا چہرہ زرد پڑ چکا ہو تو اُسے دونوں ہاتھ سے تھپڑ مار کر دشمن کے سامنے
آنے سے پہلے سرخ کر دو)۔

وہ پریشانی اور دلجمعی کا راز بھی جانتا ہے اور ہمیں بھی بتاتا ہے ؎

د دنیا پہ پریشانی کښے جمعیت دے د دنیا پہ جمعیت کښے پریشانی دہ

(ترجمہ: دولت کو لٹانے اور پریشان کرنے میں جمعیتِ خاطر ہے۔ اور اس کو جمع کرنے میں

پریشانی ہے)۔

لیکن باوجود اس کے وہ بیکاری کو سخت ناپسند کرتا ہے اور ظلم سے حاصل کیے ہوئے رزق کو زہر سمجھتا ہے۔ اگر تعریف کرتا ہے تو محنت مشقت سے کما کر کھانے کی کرتا ہے۔ ؎

څوک چه وړوبیه د دهقانۍ خوري خوارهٔ دَ حوَرد د میهانۍ خوري
چه ئے دَ ظلم خوري وارہ ئے زهر شي که سالنګوته دَ سلطانۍ خوري

ترجمہ: جو کسان کی طرح محنت کرکے روٹی کھاتا ہے وہ گویا حور و قصور کا مہمان ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ اور جو ظلم سے حاصل کرکے کھاتا ہے تو خدا کرے کہ وہ اس کے لیے زہر ہو جائے چاہے وہ سلطانی کھانے کیوں نہ ہوں)۔

هر ساعت چه په چاچئ بے بیکار تر بهتۀ نه زهٔ لا بتر ګنړم بیکار
رنځوران که کاروبار نۀ کا معذوري روغ سړے بیړولے نۀ کا څپل روزګار

(ترجمہ: جو گھڑی بیکاری میں گذرتی ہو اس سے بے کار بہتر ہے۔ بیمار اگر کام نہیں کرتے تو معذور رہتے ہیں۔ ایک صحت مند آدمی اپنا کام کیوں نہ کرے)

ملک میں رخنہ ڈالنے والوں کے متعلق کہتا ہے ؎

رخنه ګر د ملک په پسے منه بوده په خپل ملک کښے په حکمت په زرو زور په لښکر و نز
څو به توره په تو برلیه په نیزو وشي صد چندان شي په تدبیر په هنر و نز

(ترجمہ: جو لوگ ملک میں رخنہ ڈالتے ہیں اُن کا قلع قمع کرو۔ حکمت سے، زر سے زور سے اور لشکر سے۔ جو کام تلوار، تیر اور نیزوں سے ہوتا ہے اس سے سوگنا زیادہ اچھی طرح ہنر اور تدبیر سے ہوتا ہے)

طمع اور حرص ایک ایسی بلا ہے جو انسان کو اپنے مقام سے نیچے گرا دیتا ہے اور وہ ایک خود ساختہ عذاب میں ہمیشہ کے لیے مبتلا ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل فساد کی جڑ ہے۔ جو طمع اور حرص سے ناآشنا ہیں وہ ننگے بھوکے رہتے ہوئے بھی بادشاہوں سے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ خوشحال خان کہتا ہے ؎

طمع بلا دہ اسیر بندہ کا بنہ بنہ سری ئی دلتہ گندہ کا

ماویرلیدلی چہ طمع ئے لری پہ بادشاہانو پورے خندہ کا

(ترجمہ : طمع ایک بلا ہے جو انسان کو اسیر کر دیتی ہے۔ بہت اچھے اچھے لوگوں کو گندہ کر دیتی ہے۔ میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں جو بے طمع ہوتے ہیں لہٰذا بادشاہوں کا مذاق اُڑاتے ہیں)۔

ساتھ ہی وہ احسان اُٹھانے کو بھی انتہائی بُرا اور ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے۔ ؎

دَمنت دارو کہ مرم پکارے نہ دی کہ علاج سرہ مے راشی مسیحا ہم

دَ فرشتو اَمین منت دے پہ دُعا کښے لاجرم ورنہ پټہ کړم دُعا ہم

(ترجمہ : میں اگر مر بھی جاؤں تو وہ دوائی نہیں کھاؤں گا جس سے مجھے کسی کا زیرِ احسان ہونا پڑے چاہے حضرت مسیح علیہ السلام خود میرے علاج کے لیے چل کر کیوں نہ آئے۔ دُعا کرتے وقت فرشتے جو امین کہتے ہیں وہ بھی احسان ہے۔ اس لیے میں دعا بھی ان سے چھُپ کر کرتا ہوں)۔

گردشِ دولت کے متعلق آج کل تو بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن خوشحال خان کا اس کے متعلق اپنے زمانے میں جو نظریہ تھا وہ بھی سُنیئے ؎

بغہ زر تر کا نړی لوټے لا بتر دی چہ نے اوښه نے پہ زمکہ نہ خښیږی

چہ اَوبہ پہ ځائے ولاڑے شی گندہ شی صفائی نے ہم پہ دا وہ چہ بہیږی

(ترجمہ : وہ دولت پتھر اور ڈھیلے سے بھی بدتر ہے جسے زمین میں دبا کر رکھ دیا جائے اور گردش میں نہ آئے۔ پانی بھی جب ایک ہی جگہ کھڑا رہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی پاکیزگی اس سے ہے کہ وہ بہتا رہے)۔

گوہرِ مقصود حاصل کرنے کے لیے یُوں گویا ہوتا ہے ؎

کہ غوطہ دَ یے وہے پہ لاس بہ در شی چا ویلی چہ پہ دریاب کښے گوہر نشتہ

(ترجمہ : اگر تو غوطہ لگائے تو ہاتھ آ جائے گا۔ یہ تجھے کس نے بتایا ہے کہ دریا میں موتی نہیں ہیں)۔

غواصان پسے غوټے وہی پہ مرستہ　　ڈ مقصود گوہر پہ لوئے ډیاب کنبے پروت دے

(ترجمہ: گوہرِ مقصود گہرے سمندر میں پڑا ہوا ہے۔ غواص اسے ڈھونڈنے کے لیے غوطے لگا رہے ہیں)۔

دوسروں کے لیے بھلائی کے کام کرنے کے متعلق کہتا ہے ؎

چہ احسان ترے پیدا کیږی کان ہغہ　　کان دَ لعل و یاقوت ځہ کان نہ دے

چہ پہ قول و عہد دران شو دران ہغہ　　ولور چا وتہ دران مروایہ خوشحال

(ترجمہ: لعل و یاقوت کے کان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ کان تو وہ ہے جس سے دوسروں کی بھلائی پیدا ہوتی ہو۔ اے خوشحال کسی اور کو بُرا مت کہو۔ بُرا وہ ہے جو اپنے قول و عہد کا پاس نہ رکھے)۔

عشق اور عقل کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خوشحال کا فیصلہ حسبِ عادت اس کے متعلق بھی دو ٹوک ہے ؎

چرتہ ئے لاے عشقہ چہ اور گوزنے راتہ مات کرے

بیا نارسا عقل پہ تدبیر رانغلے دے

(ترجمہ: اے عشق تو کہاں ہے بھاگ۔ اور اس کے جبڑے توڑ دے۔ یہ نارسا عقل پھر اپنی تدابیر کے ساتھ میرے پاس آئی ہے)

سیرت اور صورت کے متعلق اس کی رائے یہ ہے ؎

چہ صورت سیرت ئے دواړہ وسرہ جوړ وی

دَ خوشحال و زړہ ہ پکار دے ہغہ کس

(ترجمہ: خوشحال کو وہی شخص پسند ہے جس کی سیرت اور صورت دونوں اچھے ہوں)۔

وہ ایک نہایت ہی راسخ العقیدہ اور پکا مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کہا ہے۔ ایک دعائیہ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

یا بالے کریہ! دَ خوشحال خٹک دا غواست دے

تل دَ دۀ پہ زړۀ کښے لرے ټینګ دَ دین اساس

(ترجمہ: یا الٰہی خوشحال خٹک کی یہ دُعا قبول فرما کر اس کے دل میں دین کی اساس ہمیشہ مضبوط رہے)

کردار پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہے ؎

پہ جهان کښے به دے پاتو بنه بد نوم شی

تازه چاپے دَ کسریٰ کړه دَ حجاج کړے

(ترجمہ: دنیا میں تو تیرا نام نیکی یا بُرائی کے ساتھ باقی رہے گا۔ آگے تیری مرضی کہ تو نوشیروان عادل کی طرح کام کرتا ہے یا حجاج بن یوسف کی طرح)۔

کړنوم دَ حجاج آورے نوم دَ نوشیروان

پہ عدل کافر ښه شو ظلم بد کړ مسلمان

(ترجمہ: حجاج کا نام بھی سنتے ہو اور نوشیروان کا بھی۔ عدل نے ایک کافر کو اچھا نام دیا۔ اور ظلم نے مسلمان کو بُرا نام)۔

شاہین اور جنگلی کوے کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

دَ کلاه لائق خو باز دے یا شاهین دے

په واخله چه د کلاغ په سر کلاه شی

(ترجمہ: کلاہ کا لائق تو باز ہے یا شاہین۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ کلاغ کے سر پر کلاہ ہو)۔

اس کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی بھی کام ہو وہ محض اللہ پاک کی خوشنودی کے لیے ہو۔ اللہ کی محبت میں کسی جزا کا خیال نہ آئے۔ یہی دونوں جہانوں کی خوشی کا باعث بنتا ہے۔

څوک چه دَ دنیا غواړی هغه ریحوړ دے

هر چه عقبیٰ غواړی هغه مزدور دے

هر چہ مولیٰ غواړي تر هغو زار شه

هغه په دواړو کونو مسرور دے

(ترجمہ: جو لوگ دُنیا کی طلب کرتے ہیں وہ بیمار ہیں۔ جو عقبیٰ کے طالب ہیں وہ مزدور ہیں۔
جو مولا مانگتے ہیں ان کے قربان جاؤں وہ دونوں جہان کی خوشیاں لوٹتے ہیں۔

آگے کہتا ہے ؎

دَ هوس خدایان دلرے کړه له دِله

یوه خدائے وته چه ناست په سجده ئے

(ترجمہ: تُو جو خدائے واحد کے سامنے سر بسجود ہے تو یہ ہوس کے بُت اپنے دل سے
ہٹا دے)۔

شرع کے ہوتے ہوئے وہ باقی فلسفوں کو جو غیر شرعی ہوں کیسے سمجھتا ہے ؟

فلسفه معتزله داره گمراه دي   چه بے شرعه په خپل رائے کاندِ ترغیب

(ترجمہ: جو لوگ غیر شرعی رائے کی ترغیب دیتے ہیں وہ سب گمراہ ہیں چاہے وہ فلاسفر
ہوں یا معتزلہ)۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

زهٔ تا پیدا کړم له ماؤ طین   بحره دے راکړه د دین متین

دین مے منلے د پاک رسولؐ دے   زما تو به ده له غیره دین

(ترجمہ: مجھے تُو نے خاک اور پانی سے پیدا کیا اور پھر دین متین سے بہرہ ور کیا۔ مَیں نے
اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مان لیا ہے اس کے بغیر ہر دین سے بھی میری توبہ ہے)۔

امر و نہی کے متعلق کہتا ہے ؎

امر کړه خوشحاله پسته او سه له نهي   هر چه نهي کاندي هغه زر په پښیمانی ذي

(ترجمہ: اے خوشحال! تو حکم کے تابع رہ اور منہیات سے بچتا رہ۔ جو نہی کے کام کرتے ہیں وہ بہت جلد پشیمان ہو جاتے ہیں)۔

مظلوموں سے زیادتی کرنے والے خان کے متعلق بھی اس کی رائے سن لیجئے ؎

واچہ خانان دی یا امرا کان دی — پہ ہند کښې گرځي پہ ہر مکان دی

غوښې ھډ وڼہ دَ مظلوما نو خوري — زما ترفہم دا ہرہ دوان دی

(ترجمہ: یہ خان اور اُمرا، جو ہندوستان میں پھرتے ہیں اور کوئی جگہ اُن سے خالی نہیں، میرے خیال میں تو یہ درندے ہیں جو مظلوموں کی ہڈی اور گوشت کھاتے ہیں)۔

اس کی اہلیت کا معیار بھی بتاتا ہے ؎

وخانی وتہ ور زغلہ ہنر بیخ نہ — وعالم وتہ پیدا کړہ دردِ سر

خانی کار دَ ہر چاپنہ دہ دَ ښغہ دہ — چہ صرف شے نہ پہ سر دی نہ پہ زر

(ترجمہ: بغیر کسی ہنر کے خان بن بیٹھو اور دُنیا والوں کے لیے دردِ سر بن جاؤ۔ خان بننا ہر ایک کا کام نہیں۔ خان صرف وہ ہو سکتا ہے جو زر اور سر دونوں سے بے نیاز ہو جائے)۔

محنت اور راحت کے متعلق کہتا ہے ؎

(ترجمہ: جو جنگجو ہیں دولت اُن کو ملتی ہے جو غیرت اور ناموس کی حفاظت کرتے ہیں وہ عزت پاتے ہیں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کہ جو محنت کرتے ہیں وہی راحت پاتے ہیں)

شہرت کی خواہش کے متعلق یوں گویا ہے ؎

لکہ چہ شوی دی زمالہ دستہ — شوی بہ نہ وی لرے پرستہ

شہرت بلا دے سہے گمراہ کا　　　　دوۂ دوستی دہ تر ہر څہ مستہ

(ترجمہ: جو کچھ میرے ہاتھ سے ہوا ہے وہ کسی مے پرست نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ شہرت کی خواہش ایک بلا ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس کی مستی سب مستیوں سے بڑھ کر ہے)۔

راستی کے متعلق اپنی رائے یوں دیتا ہے ؎

راستی لیاره ده بادشاهی　　　　کښې نشته گمراهي

در بښتیو پرواه نشته　　　　د جهان په بد خواهي

در بښتیو سره مل وي　　　　تل نصرت د الهي

در بښتیو ځائے جنت دے　　　　د قرآن په گواهي

بیا به نه وے خوشحال　　　　په راستي کښې تباهي

(ترجمہ: راستی شاہی سڑک ہے اس میں کوئی گمراہی نہیں۔ راست باز دنیا کی بدخواہی کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے۔ راست بازوں کے ساتھ نصرت الہٰی ہوتی ہے۔ قرآن پاک گواہ ہے کہ راست باز جنت میں جائیں گے۔ اے خوشحال! راستی میں کوئی تباہی نہیں ہے)۔

خوشحال خان خٹک پر لاہور کی مدیحہ فیروز الدین نامی جس خاتون نے پہلی دفعہ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس نے اس کی کتابوں کی تعداد تین سو پچاس بتائی ہے۔ میجر راورٹی نے یہ تعداد دو سو پچاس بتائی ہے۔ جبکہ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب صرف سولہ کتابیں دستیاب ہیں مگر آج کل دستیاب کتابیں صرف بارہ رہ گئی ہیں:۔

(۱) دیوان۔ (۲) صحت البدن۔ (۳) باز نامہ۔ (۴) ہدایہ۔ (۵) آئینہ۔ (۶) فضل نامہ۔ (۷) سوات نامہ۔ (۸) فرخ نامہ۔ (۹) دستار نامہ۔ (۱۰) بیاض کے کچھ حصے۔ (۱۱) فراق نامہ۔ (۱۲) اخلاق نامہ۔

کتابوں کی تعداد جو بھی ہو اس کی اتنی اہمیت نہیں۔ اگر وہ اور کچھ بھی نہ لکھتے اور صرف کلیات کا ایک نسخہ چھوڑ جاتا پھر بھی اس کی علمی اور ذہنی عظمت یہی رہتی جو ہے۔ البتہ اس کو سمجھنے اور محسوس

کرنے کے لیے دیکھنے والی آنکھوں سننے والے کانوں اور سمجھنے والے دلوں کی ضرورت ہے۔اس کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا کہ ؎

دَ خوشحال قدر کړا وس پہ بیحا نشتہ
پس لہ مرگہ بہ ئے یاد کا دیر عالم

(ترجمہ: خوشحال کی قدر اگر اب کوئی نہیں کرتا تو موت کے بعد ایک دُنیا اُس کو یاد کرتی رہے گی)
لیکن اُس کی یہ بات اُس وقت بھی درست تھی اور آج بھی درست ہے۔

نۂ بہ زما غندې بل تکیالے راشی
نۂ بہ زما غندې بل جنگیالے راشی
خټک لا پرېږده پہ درست افغان کښے
عجب کہ ہسے فرنګیالے راشی

(ترجمہ: نہ کوئی ایسا شہسوار دوسرا آسکے گا۔ نہ کوئی دوسرا ایسا غیرت مند آسکے گا)
خٹک تو کیا تمام پشتونوں میں نہ کوئی ایسا دانش مند پیدا ہوگا۔

اشاریہ

ت